رجسٹرڈ ایل [illegible]

جلد ۵ عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

[illegible]

سالانہ چندہ [illegible] روپیہ [illegible]

نئی مطبوعات

حسبِ ذیل کتابیں نئی طبع ہو کر ہمارے ہاں آ گئی ہیں
اب آپ اپنی ضرورت کے مطابق طلب فرما سکتے ہیں

اذکارِ مسنونہ

از امام ابنِ قیمؒ ترجمہ و حواشی از مولانا خلیل احمد حامدی،
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازیں اور نماز کے علاوہ پڑھی جانے والی دُعاؤں اور اذکار کا مجموعہ ــــ قسم اعلیٰ مع دیدہ زیب گردپوش ۳/۷۵ ــــ سستا ایڈیشن ۲/۵۰

تصانیف سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

کتاب	تفصیل	قسم اعلیٰ مع دیدہ زیب گردپوش	سستا ایڈیشن
تفہیم القرآن	جلد اوّل سورۂ فاتحہ تا سورۂ انعام۔ اُردو زبان میں قرآن مجید کے مطالب سمجھنے کا اس تفسیر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے	۲۱/۲۵	۱۶/۲۵
خطبات	پندرھواں ایڈیشن، اسلام، کلمۂ طیبہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد پر نہایت آسان اُردو میں ۲۸ خطبات، جن کی ہر سطر ایمان میں اضافہ اور عمل پر آمادہ کرتی ہے	۴/۲۵	۲/۷۵
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	صحیح معنوں میں فہم قرآن کی کنجی، یہ کتاب پڑھ کر قرآن مجید پڑھیے معرفتِ قرآن کے دروازے کھل جائیں گے	۲/۵۰	۱/۷۵
اسلام اور جدید معاشی نظریات	جدید معاشی نظریات کا نہایت سائنٹفک اور حکیمانہ تجزیہ اور ان کا اسلام سے تقابل،	۲/۲۵	ــــ
سُود	(مکمل نظرثانی اور عظیم اضافوں کے ساتھ) سُود کے مسئلہ پر دینی، عقلی اور اقتصادی نتائج کے لحاظ سے ایک بے مثل کتاب، اقتصادیات کے علماء اور طلباء کے لیے ایک بنیادی کتاب۔	۵/۵۰	۳/۲۵
حقوق الزوجین	(طبع ہفتم) اسلام میں میاں اور بیوی کے باہمی حقوق و فرائض پر ایک مبسوط اور مستند کتاب جس کی ملکی عدالتوں میں سند مانی جاتی ہے	۲/۵۰	۱/۷۵
تجدید و احیائے دین	(بعد نظرثانی و اضافہ ساتواں ایڈیشن)	۲/۵۰	۱/۷۵
رسالہ دینیات	اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کا بہترین ذریعہ، اُردو (بیسواں ایڈیشن)	۲/۵۰	۱/۵۰
	انگریزی (ساتواں ایڈیشن)	۴/۵۰	ــــ
دین کی باتیں	(از مولانا عبدالحی رامپوری) تعلیم بالغاں کے لیے بالخصوص اور عام تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کے لیے اسلامی تعلیمات کو جاننے کا آسان ترین ذریعہ	ــــ	۲/۰۰
موتیوں کا ہار	(حصہ اوّل تا چہارم) از افضل حسین ایم اے، ایل ٹی۔ بچیوں کے لیے سچے موتیوں کے ہار سے بھی زیادہ قیمتی تحفہ مکمل سیٹ	ــــ	۱/۵۰

نوٹ: اس اشتہار کے حوالے سے چھ روپے یا زائد رقم کے جو آرڈر ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء تک وصول ہوں گے محصول ڈاک خریدار سے وصول نہیں کیا جائے گا اور جو آرڈر دس روپے سے زیادہ کے ہوں گے ان پر قیمت میں دس فیصدی مزید رعایت دی جائے گی۔

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، ۱۳ ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۷	اکتوبر ۱۹۶۱ء	عدد ۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

الحاد و بے دینی کے اس دور میں دین پسند لوگوں کو جس قسم کے نامساعد حالات سے قدم قدم پر سابقہ پیش آتا ہے اُس سے ہر وہ شخص پوری طرح آشنا ہے جس نے زندگی کے کسی مرحلے پر بھی غیر دینی قوتوں سے مصالحت کے بغیر زندہ رہنے کی کوشش کی ہے۔ لادینی قوتوں نے سیاسی تفوق حاصل کرنے کے بعد دنیائے اسلام میں ایک ایسا ماحول تیار کر دیا ہے جس میں نہ صرف بے دین طاقتوں کو غلبہ حاصل ہے بلکہ انہوں نے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت اس بات کا بھی پورا التزام کیا ہے کہ ہر لحظہ گمراہیوں کے طوفان اٹھتے رہیں، لوگوں کے دلوں سے خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی مقدس پنکھڑیاں مرجھا جائیں اور اُن کی جگہ دنیا پرستی اور فسق و فجور کی اکاس بیل ان کے دل و دماغ پر پوری طرح اپنا تسلط قائم کر لے۔ ان حوصلہ شکن حالات میں جبکہ دینی کام کرنے والوں پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہے، دین کو بلند کرنے کی کوئی جد و جہد، خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی میں کی جائے بآسانی حوصلے سے انجام دی جا سکے: بڑا ہی صبر آزما اور کٹھن کام ہے اور اس راہ کی مشکلات کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو محض ساحل پر کھڑے ہو کر طوفانوں کا نظارہ کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ سمندر کے اندر اتر کر مخالفتوں کے تھپیڑے برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔

باقی شعبوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اسلامی لٹریچر کی تدوین و اشاعت کے متعلق بڑے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو حضرات یہ کام کر رہے ہیں وہ واقعی بڑے

حوصلہ شکن حالات میں کام کر رہے ہیں۔ اس دور میں جبکہ جدید ادب کی لذتیت نے لوگوں کے مذاق کو بالکل بگاڑ دیا ہے کسی دینی کتاب کا شائع کرنا یا دینی رسالہ کا زندہ رہنا محض تائید ایزدی ہے۔ ورنہ حالات تو ایسے "بے لذت ادب" کی اشاعت کے بالکل متحمل نظر نہیں آتے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحیمی اور کریمی کا کرشمہ ہے کہ ترجمان القرآن جیسا "خشک" پرچہ گذشتہ اکتیس سال سے مسلسل مذاقِ عام کے خلاف کام کر رہا ہے، نہ صرف یہ کہ اس پوری مدت میں تمام حوادث کے باوجود زندہ رہا، اور کامیابی کے ساتھ چلتا رہا، بلکہ اس کے "منصبِ رسالت نمبر" کو غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس پر ہم منعمِ حقیقی کی بارگاہ میں جس قدر سجدۂ شکر بجا لائیں کم ہے۔ یہ نمبر بیس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے اور ابھی مزید مانگ آ رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ انکارِ حدیث کے گمراہ کن اور فتنہ انگیز پراپیگنڈا سے سخت تنگ آئی ہوئی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں کسی معقول اور سنجیدہ طرزِ استدلال کے لیے سخت بیتاب تھی۔ وہ جب اس کے سامنے آیا تو اس نے اسے اپنی ہی گم شدہ متاعِ عزیز سمجھ کر جذب و شوق سے قبول کیا۔ ہمارے نزدیک تعداد کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد نہ تو حصولِ شہرت ہے اور نہ جلبِ منفعت۔ اس کی غرض شروع سے صرف ایک ہی ہے کہ جس مقدس نظام کو حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے لیکر دنیا میں تشریف لاتے ہیں اسے ان کی ہدایت کے مطابق دنیا میں نافذ کیا جائے۔ اگر جاہ و مال کا حصول پیشِ نظر ہوتا تو پھر خطرات کو دعوت دینے کے بجائے اقتدار کے سایہ میں عافیت تلاش کی جاتی اور یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ہمارے نزدیک دیکھنے کی چیز وہ جذبۂ اخلاص ہے جس کے تحت لوگوں نے اس گراں قیمت اشاعتِ خاص کا خیر مقدم کیا ہے۔ اور اس سے اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس امت کی عظیم اکثریت سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کس قسم کے پاکیزہ جذبات رکھتی ہے۔ اس پرچہ کی مانگ امت کے ہر طبقہ میں ہوئی ہے۔

پروفیسر، وکلاء، تجار، کارخانہ دار، ملازمین، ڈاکٹر، اطبائے تعلیم یافتہ اور قدیم درسگاہوں کے فارغ التحصیل، غرض سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس نے اس کی اشاعت میں اپنی بساط کے مطابق حصہ نہ لیا ہو اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں بہت سے ایسے حضرات بھی ہمارے شریک کار رہے ہیں جنہیں ہمارے ساتھ بعض مسائل میں شدید اختلاف رہا ہے۔ یہ سب اُسی کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ اس میں ہماری اپنی محنت اور قابلیت کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

اَللّٰھُمَّ نَسْئَلُکَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ وَنَسْأَلُکَ عَزِیْمَۃً فِی الرُّشْدِ وَنَسْأَلُکَ شُکْرَ نِعْمَتِکَ وَحُسْنَ عِبَادَتِکَ وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّۃِ وَالنَّجَاۃَ مِنَ النَّارِ

گذشتہ ماہ کے واقعات میں امتِ مسلمہ کے لیے جو واقعہ سب سے زیادہ دلفگار اور نتائج کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے وہ ترکی کی فوجی عدالت کا وہ ناعاقبت اندیشانہ فیصلہ ہے جس کے تحت یاسیدہ کے جزیرے میں چار سو ننانوے افراد کے خلاف مقدمہ چلا کر ۱۵ کو موت کی سزا، ۳۱ کو عمر قید کی سزا، اور ۴۸۰ کو ایک سال سے ۱۵ سال قید کی سزا دی گئی۔ جن بدنصیب ۱۵ افراد کو پھانسی کا حکم سنایا گیا ان میں سے ۱۲ افراد کی سزائے موت کو تو عمر قید میں تبدیل کیا گیا مگر ترکی کے تین نامور افراد یعنی سابق وزیر اعظم عدنان مندریس، وزیر مال فطین زورلو اور وزیر خارجہ حسین قورلتان کو پوری دنیا کے احتجاجوں، عرضداشتوں اور اپیلوں کے باوجود تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ خونیں ڈرامہ اس سرعت کے ساتھ کھیلا گیا کہ دنیا محوِ حیرت رہ گئی اور عام طور پر لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ عدالت کی یہ ساری کارروائی اول تا آخر محض ایک ڈھکوسلا تھی جس کا مقصد ہی مندریس اور اس کے ساتھیوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ انصاف کی تاریخ کا یہ دلچسپ ترین مقدمہ تھا کہ اس میں صفائی کے گواہ بھی استغاثہ کی طرف سے پیش کیے گئے تھے اور صفائی کے لیے وکیل بھی حکومت ہی نے

مقرر کیا تھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب حکومت کے اپنے مقرر کردہ وکیل صفائی نے اپنے مؤکل کے حق میں زوردار دلائل پیش کیے اور استغاثہ نے محسوس کیا کہ اس کا مکر و فریب آشکارا ہونے لگا ہے تو وکیل صفائی کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد ان بے کسوں کی صفائی کے لیے جو دوسرا وکیل مامور ہوا وہ چونکہ اپنے سامنے حق گوئی کا حشر دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے کذب و باطل کے آگے سرنگوں ہونے ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور استغاثہ کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا گیا۔ مقدمہ کے دوران میں ملزموں کے ساتھ "عدالت" پے در پے تذلیل اور درشتی کا جو رویہ ظاہر کرتی رہی اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دراصل یہ عدالت نہیں ہے بلکہ استغاثہ ہی کا ایک شعبہ ہے۔ پھر دوران مقدمہ میں ان ملزموں کو جو اذیتیں دی گئیں اور ان کے ساتھ جو وحشتناک سلوک روا رکھا گیا وہ ایک دلخراش داستان ہے۔ ان بدنصیب لوگوں میں بہت سے ایسے تھے جو ان تکلیفوں کو برداشت نہ کر سکے اور اپنے حواس کھو بیٹھے، حتیٰ کہ بعض نے اس اعصابی کش مکش اور خوف و ہراس سے نجات پانے کے لیے خودکشی کر لی۔

یہ عدالتی ڈرامہ اپنی مضحکہ خیزی میں اور اس کا ڈراپ سین اپنی ہولناکی میں اُس ڈرامے سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے جو چند سال پہلے قاہرہ میں اخوان المسلمین کے خلاف کھیلا گیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ مسلمان ملکوں میں مغربی تہذیب کے دلدادہ اور لادینی کے علمبردار حضرات جس روشن خیالی، جس وسیع النظری (لبرلزم)، جس جمہوریت، اور جن اعلیٰ اصولوں کی پیروی کے مدعی ہیں، ان ساری چیزوں کی حقیقت کیا ہے۔ دراصل یہ لوگ جہاں بھی ہیں اپنی مسلم قوم کی عظیم اکثریت کے اندر ایک بہت چھوٹی سی اقلیت ہیں جسے نظم و نسق، تعلیم، عدالت، فوج اور معیشت میں مضبوط پوزیشن حاصل ہو گئی ہے۔ اب یہ اقلیت محض اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنی مرضی زبردستی اپنی قوم پر مسلط

کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کوشش میں جمہوریت، آئین، قانون، انصاف، اور مقدس ترین ہر چیز کو اس نے بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ مذہب کا راستہ روکنے کے لیے وہ ہر بازی کھیلنے اور ہر چال چلنے کے لیے تیار ہے، اور اہلِ مذہب پر جن برائیوں کا وہ الزام رکھتی ہے اس سے ہزار گنی زیادہ برائیوں کا وہ خود مظاہرہ کر رہی ہے۔

ترکی میں ملک کی فوج نے جس کا اصل فرض وطن کی حفاظت اور پاسبانی کرنا تھا، آئین کو پامال کر کے اور سیاست میں بے جا مداخلت کر کے خود اپنے ہی بھائی بندوں کے ساتھ جو ظلم کیا ہے وہ تاریخ کی ایک نہایت ہی اندوہناک داستان ہے۔ یہ اسی کی مداخلت کا نتیجہ ہے کہ جن لوگوں کو قوم کی اکثریت کا اعتماد حاصل تھا وہ زبردستی ہٹا کر پھینک دیئے گئے اور عصمت انونو کی پارٹی جو بہت چھوٹی اقلیت کی نمائندہ تھی رائے عام کی تائید حاصل کیے بغیر اوپر اٹھا لائی گئی۔ اس اکھیڑ پچھاڑ میں جن لوگوں کو گرایا گیا انہیں صرف گرانے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ انہیں پھانسیوں پر بھی لٹکا دیا گیا۔ یہ شدید جذبۂ انتقام کچھ اس وجہ سے نہ تھا کہ عدنان مندریس اور جلال بایار مذہبی گروہ کے لوگ تھے اور لادینی نظام سے دینی نظام کی طرف ملک کو پلٹائے لیے جا رہے تھے۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ بھی مصطفیٰ کمال کے متبعین ہی میں سے تھے اور اسی سیکولرزم کے قائل تھے جس کے عصمت انونو اور یہ فوجی حضرات ہیں۔ دراصل ان کے خلاف یہ سارا غصہ اتنی سی بات پر تھا کہ مذہب اور اہلِ مذہب کو، جنہیں ترکی مسلمانوں میں ۹۹ فی صدی سے بھی زیادہ اکثریت حاصل ہے، انہوں نے ذرا سی ڈھیل بھی کیوں دی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کہیں اکثریت کے منشا کے مطابق مذہب کے حامی برسرِ اقتدار آتے نظر آتے تو یہ "روشن خیال" اور "وسیع المشرب" (لبرل) لوگ، جو آج بھی جمہوریت کے ڈھول پیٹ رہے ہیں، اپنی روشن خیالی اور جمہوریت پسندی کے کیسے نمونے پیش کرتے۔

ترکی میں یہ جو کچھ ہوا ہے وہ درحقیقت اُس وسیع کشمکش کا بالکل قدرتی نتیجہ ہے جو دین پسند طاقتوں اور لادینی قوتوں کے درمیان گذشتہ ایک صدی سے پوری دنیائے اسلام میں جاری ہے۔ ترکی ہی وہ ملک ہے جس میں یہ کشمکش سب سے پہلے کھل کر نمودار ہوئی اور اس کے نتائج پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا پر آشکارا ہوئے۔ اس لیے اس ملک کے حالات کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے ازحد ضروری ہے۔

ترکی ایک ایسا ملک ہے جو مغربی ممالک کے عین درمیان واقع ہے۔ کئی صدیوں تک وہ اہلِ مغرب سے برسرپیکار رہا۔ پہلے اس کی جنگ فاتحانہ تھی پھر مسلسل دو صدیاں ایسی گزریں جن میں وہ اہلِ مغرب سے شکست پر شکست کھاتا چلا گیا، حتیٰ کہ جنگ عظیم اوّل میں اس کی شکست انتہا کو پہنچ گئی۔ ابتداءً یہ شکستیں صرف مادّی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ مکمل دماغی و روحانی شکست میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ آدمی کا خاصہ ہے کہ جب وہ کسی مدّمقابل سے پٹتا ہے تو بڑا سخت جذبۂ انتقام اس میں ابھرتا ہے۔ لیکن جب وہ پے در پے مار کھاتا ہی چلا جاتا ہے تو آخر کار سخت مرعوبیت کے ساتھ ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ جنگ عظیم اوّل کے خاتمے پر ترک اسی ذہنی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اپنی پستی و ذلّت اور مغرب کی برتری کو انتہائی عروج پر دیکھ کر اس کے جسم ہی نے نہیں، اس کے دل و دماغ اور اس کی روح نے بھی مغرب سے ہار مان لی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو مغربی تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگ دینے، بلکہ پوری طرح جذب کر دینے کے سوا اور کسی چیز میں خیر نہیں ہے۔

اس عمل کا آغاز ۱۹۲۴ء میں "خلافت" کے خاتمے سے کیا گیا، اور اس کے بعد جلد ہی ترکی دستور کی وہ دفعہ منسوخ کر دی گئی جس کی رو سے سلطنت کا مذہب "اسلام" تھا۔ یہ تغیر ابتدا میں تو اس دعوے کے ساتھ کیا گیا تھا کہ ہم سیاست کو مذہب سے الگ کرنا چاہتے ہیں، مگر کچھ دیر نہ گزری تھی کہ مذہب کو سیاست کے تابع کرنے اور پھر اس کی جڑ کاٹنے کا

سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسلامی شریعت جسے ملک میں قانون کی حیثیت حاصل تھی، منسوخ کر دی گئی اور اس کی جگہ سوئٹزرلینڈ کا دیوانی، اور اٹلی کا فوجداری، اور جرمنی کا تجارتی قانون لا کر نافذ کر دیا گیا۔ پھر شریعت کو مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے بھی باقی نہ رہنے دیا گیا، حالانکہ کفار تک نے مسلم ممالک پر قابض ہونے کے بعد اسے اس حیثیت میں برقرار رکھا تھا۔ وراثت میں عورتوں کا حصہ مردوں کے برابر قرار دیا گیا۔ تعدد ازواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرایا گیا۔ اور طلاق کا اختیار مرد سے کلی طور پر سلب کر کے عدالت کے حوالے کر دیا گیا۔ قرآن کے صریح احکام سے یہ انحرافات اس بات کی کھلی علامت تھے کہ اب اسلامی قانون ترک مسلمانوں کی خانگی زندگی تک کا قانون بھی نہیں رہا ہے۔

دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ پورے ملک میں مذہبی تعلیم کے مدارس بند کر دیئے گئے، سرکاری مدرسوں کے نصاب سے مذہب کی تعلیم خارج کر دی گئی، ابتدائی تعلیم کا پورا نصاب فرانس سے لا کر جوں کا توں نافذ کر دیا گیا، عربی رسم الخط کو قانوناً منسوخ کر کے لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا، ترکی زبان سے عربی و فارسی الفاظ خارج کرنے کی مہم چلائی گئی، عربی اذان کے بجائے ترکی اذان حکماً رائج کی گئی، اور قرآن مجید کی اصل عبارت کو بھی عربی حروف کے بجائے لاطینی حروف میں شائع کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان میں سے ہر تدبیر کا ہدف یہ تھا کہ ترکی قوم کا رشتہ اسلام اور مسلمانوں سے کاٹ کر اہلِ مغرب اور مغربی تہذیب سے جوڑ دیا جائے۔

تیسرا قدم لباس کی تبدیلی تھا۔ ۱۹۲۵ء میں مغربی لباس اور ہیٹ پہننا ترکی باشندوں کے لیے قانوناً لازم کر دیا گیا اور ایک خاص تاریخ مقرر کر دی گئی جس کے بعد کوئی شخص پبلک میں ہیٹ اور مغربی لباس کے سوا کوئی دوسری چیز پہن کر نہ آسکتا تھا۔ اس تبدیلی کا مقصود یہ تھا کہ سارے ترک یورپین بن جائیں اور اہلِ یورپ بھی انہیں یورپین سمجھ لیں۔ لیکن امریکہ اور یورپ میں آج بھی ترکوں سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ کا قومی لباس کیا ہے۔ کیونکہ ہیٹ اور سوٹ کو وہ جانتے ہیں کہ یہ ترکوں کا قومی لباس نہیں بلکہ مانگے کا لباس ہے۔ اور خود ترک

بھی اب تک اسے اپنا قومی لباس نہیں سمجھتے ۔ انتخابات کے زمانے میں لادینی اور فرنگیت کے بڑے بڑے علمبردار تک اندرونی ترکی میں جب ووٹ لینے جاتے ہیں تو ہیٹ پہن کر نہیں جاتے !

چوتھا قدم ترکی ناموں کا تغیر تھا۔ ۱۹۳۴ء میں از روئے قانون لازم کیا گیا کہ ہر ترک اہل مغرب کی طرح اپنا ایک SURNAME اختیار کرے۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات تھی لیکن دراصل اس طریقے سے جو تحریک چلائی گئی وہ یہ تھی کہ ترکوں کے نام مسلمانوں کے سے نہ رہیں، چنانچہ عملاً ایسا ہی ہوا۔ مثلاً ایک خاتون فاطمہ خانم سے بایان ویمیر بن گئیں، اور ایک صاحب کا نام نورالدین سے نوری ایڈن بنا اور پھر وہ صرف ڈاکٹر ایڈن بن کر رہ گئے۔ آج ترکی کے بکثرت نام اخبارات میں ایسے آتے ہیں جنہیں دیکھ کر بیرونی ممالک کے مسلمان یہ تصور تک نہیں کر سکتے کہ یہ مسلمانوں کے نام ہیں۔

اس پر مزید پردے کا خاتمہ، عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط، اور مغربی ثقافت کے جملہ لوازم کا رواج تھا جسے درحقیقت اسلام اور اس کی تہذیب سے انقطاع پر آخری مہر توثیق سمجھنا چاہیے۔ پھر ۱۹۳۵ء میں ایک بہت بڑا "اصلاحی" قدم یہ اٹھایا گیا کہ جمعہ کی تعطیل کا دن موقوف کر کے اتوار کو عام تعطیل کا دن مقرر کر دیا گیا۔ شاید قومی ترقی کے راستے میں آخری رکاوٹ یہی باقی رہ گئی تھی۔

یہ تغیرات جنہیں اہل مغرب اپنی اصطلاح میں "اصلاحات" کہتے ہیں اور ان پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے ہیں، کچھ یونہی نہیں ہو گئے بلکہ انہیں انتہائی زبردستی اور سخت ظلم و ستم کے ساتھ نافذ کیا گیا۔ ترکی کے عام مسلمان اپنی دینداری اور اسلام پسندی میں دنیا کی کسی مسلمان قوم سے کم نہیں ہیں۔ وہ ان میں سے کسی تغیر پر راضی نہیں تھے اور نہیں ہو سکتے تھے۔ صرف ایک چھوٹی سی فرنگیت زدہ اقلیت یہ تغیرات چاہتی تھی، اور چونکہ اسے فوج ملکی نظم و نسق اور سیاسی نظام پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا اس لیے وہ ایک ایک تغیر کو زبردستی

اپنی قوم پر ٹھونستی چلی گئی۔ ترکی کے مشرقی صوبوں میں اس پر پے در پے بغاوتیں ہوئیں ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۷ء کی بغاوتیں تو اچھی خاصی شدید تھیں۔ مگر ان کو پوری طاقت سے کچلا گیا اور ۱۹۳۷ء کی بغاوت کے بعد پورے ۹ سال تک مشرقی اضلاع میں مارشل لا نافذ رہا۔ دوسرے علاقوں میں اگرچہ کوئی مسلح بغاوت نہیں ہوئی لیکن اس غلط پالیسی کی بدولت قوم اور حکومت کے درمیان ایک خاموش کشمکش برپا ہوگئی۔ قوم کا دلی تعاون حکومت کو حاصل نہ رہا۔ تعاون کی جگہ عام لوگوں کی نفرت و بیزاری نے ایک پرامن مزاحمت کی کیفیت پیدا کر دی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی قوم کسی میدان میں بھی وہ ترقی نہ کر سکی جو قوم اور حکومت کے دلی تعاون کی صورت میں کر سکتی تھی۔ ترکوں کے ملک میں ذرائع و وسائل کی کمی نہیں ہے۔ ترکوں میں صلاحیتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ۲۷ سال کی مدت اس کے لیے بہت کافی تھی کہ وہ ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ آخر اتنی ہی مدت میں جاپان اپنے قلیل تر وسائل سے مغربی قوموں کا ہمسر بن چکا تھا۔ مگر ترکی کے برسر اقتدار طبقے نے یہ قیمتی زمانہ اپنی ہی قوم کے عقائد اور ایمان و ضمیر سے لڑنے اور اس کی تہذیب و روایات کو کچلنے میں صرف کر دینا زیادہ پسند کیا، خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ وہ ہر چیز میں امریکہ کے دریوزہ گر بن کر رہیں اور روس کا کابوس ہر وقت ان کے سر پر سوار رہے۔

اس مدت میں ترکوں نے یہ اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ ان کے حکمرانوں کی اس پالیسی نے انہیں کہاں پہنچا کر چھوڑا ہے۔ رسم الخط بدل کر وہ اپنے ماضی سے بالکل کٹ گئے اور صدہا برس کی علمی میراث جو انہیں اپنے اسلاف سے ملی تھی یک لخت ان کے لیے حرف بے معنی بن کر رہ گئی۔ مذہب کو زندگی سے خارج کر کے ان کی نئی نسلوں کے لیے اخلاق کی کوئی بنیاد باقی نہ رہی۔ اسلام کے رشتے کو تیاگ کر وہ دنیا کی تمام مسلمان قوموں سے قطعاً بے تعلق ہو گئے

اور مشرق سے مغرب تک، کوئی ان کا ہمدرد نہ رہا۔ جن مغربی قوموں سے جڑنے کے لیے انہوں نے یہ سارے پاپڑ بیلے، وہ اس بات پر تو بہت دل کھول کر انہیں داد دیتی رہیں کہ وہ اسلام کی جگہ مغربی تہذیب اختیار کر کے بڑی روشن خیالی کا ثبوت دے رہے ہیں، مگر انہوں نے ایک دن کے لیے بھی انہیں اپنا نہ سمجھا اور نہ اپنے برابر کی حیثیت دی۔ اس صورت حال کی تلخی کو بے دین اقلیت تو محسوس نہیں کرتی تھی، مگر ان کی بہت بڑی اکثریت شدت کے ساتھ اسے محسوس کر رہی تھی اور اس کا مداوا کرنے کے لیے بیتاب تھی۔

۲۲-۲۳ سال تک حکومت کے بدلنے کی کوئی پُرامن آئینی صورت ترکی میں نہ تھی، کیونکہ ملک میں صرف ایک ہی پارٹی کی حکومت تھی اور از روئے قانون کوئی دوسری پارٹی وجود میں نہ آسکتی تھی۔ مگر ۱۹۴۶ء میں رائے عام کے دباؤ سے یہ قانون بدلنا پڑا اور کمالی انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ دوسری جماعتیں وجود میں آنے کا امکان پیدا ہوا۔ اس طرح گرفت ڈھیلی پڑنے سے ترکی قوم کو یہ موقع مل گیا کہ "لادینی" کے پیروؤں ہی میں سے کم از کم ایسے آدمیوں کو انتخابات میں اُبھار کر لائے جو مذہب کے حامی نہ سہی، اس کی بیخ کنی کرنے والے تو نہ ہوں۔

قوم کے ان رجحانات سے ملک میں کوئی بھی ناواقف نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ قوم انتہائی دل برداشتگی کے ساتھ اس پالیسی کی مار سہہ رہی ہے جو مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو زبردستی اُس پر ٹھونستے رہے ہیں۔ اس لیے مقابلہ میں دوسری پارٹی بننے کے مواقع پیدا ہوتے ہی کمالی پارٹی کے اپنے ممبروں میں سے بکثرت لوگوں نے یہ بھانپ لیا کہ قوم کے مذہبی جذبات سے اپیل کر کے وہ انتخابات میں حکمران گروہ کو چت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں ٹھیک یہی نتیجہ رونما ہوا اور عصمت انونو بھاری اکثریت سے شکست کھا کر جلال بایار اور عدنان میندریس کی پارٹی کے لیے جگہ خالی کرنے پر

مجبور ہوگئے۔ بیندریس مرحوم کو خواہ کوئی شخص مخلص مانے یا منافق قرار دے، بہرحال اس امر واقعہ سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کی کامیابی کی واحد وجہ یہ تھی کہ ترکی قوم مذہب کے معاملہ میں ان سے اعتدال اور ڈھیل کی توقع رکھتی تھی۔ یہ اس بات کا کھلا ہُوا ثبوت ہے کہ کمال اتاترک اور عصمت اینونو ۲۷ سال تک جس پالیسی پر ترکی کو زبردستی دھکیل رہے تھے، قوم اس پر راضی نہ تھی اور بے چینی کے ساتھ اسے بدلنے کے لیے موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ اُن لوگوں کے اخلاق و کردار پر ترکی قوم کی طرف سے ایک بدترین تبصرہ تھا جو جمہوریت کے جھوٹے نعرے بلند کر کے اپنی قوم کی گردن پر سوار ہوتے اور اس کی مرضی کے خلاف ربع صدی سے زیادہ مدت تک حکمرانی کرتے رہے۔

نئی قیادت جو رائے عام کی تائید کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئی یہ خود اسلامی شریعت کی کس حد تک پابند تھی، اس کے متعلق اختلاف رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس قیادت نے عوامی خواہشات کا پورا پورا احترام کیا اور اس اعتبار سے اس کا یہ طرزِ عمل جمہوریت کے عین مطابق تسلیم کیا جانا چاہیے۔ یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ کوئی حکمران پارٹی اپنی قوم کی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون کرنے لگے اور اُسے جوتے کے زور سے ایسے راستوں پر ہانکنے کا عزم کرے جنہیں وہ قوم اپنے لیے انتہائی خطرناک سمجھتی ہو۔ خصوصاً جمہوریت کا نام لے کر یہ استبداد اور پرلے درجے کی بددیانتی ہے۔ عدنان بیندریس اور اُس کے رفقاء کار نے ایمانداری کے ساتھ قوم کی اکثریت کے جذبات کا لحاظ کیا اور اسے اسلام کی طرف پلٹنے کے مواقع فراہم کیے۔ چنانچہ اُن کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ

— مسجدوں کے دروازوں سے قفل کھل گئے۔ کثرت سے نئی مسجدوں کی تعمیر بھی ہوئی اور پرانی خستہ حال مسجدوں کی تجدید بھی کی گئی۔

— مسلمان قوموں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا گیا۔ عربوں سے تعلقات (باقی صفحہ ۵۶ پر)

تفہیم القرآن

الاحزاب

نام: آیت ۲۰ کے فقرہ یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْهَبُوْا سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول: اس سورۃ کے مضامین تین اہم واقعات سے بحث کرتے ہیں۔ ایک، غزوۂ احزاب جو شوال ۵ھ میں پیش آیا۔ دوسرے، غزوۂ بنی قریظہ جو ذی القعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ تیسرے حضرت زینب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جو اسی ماہ ذی القعدہ میں ہوا۔ ان تاریخی واقعات سے سورۃ کا زمانۂ نزول ٹھیک متعین ہو جاتا ہے۔

تاریخی پس منظر: جنگِ اُحُد (شوال ۳ھ) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے تیر اندازوں کی غلطی سے لشکرِ اسلام کو جو شکست نصیب ہو گئی تھی اُس کی وجہ سے مشرکینِ عرب، یہود اور منافقین کی ہمتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور انہیں امید بندھ چلی تھی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان بڑھتے ہوئے حوصلوں کا اندازہ اُن واقعات سے ہو سکتا ہے جو اُحُد کے بعد پہلے ہی سال میں پیش آئے۔ جنگِ اُحد پر دو مہینوں سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ نجد کے قبیلۂ بنی اسد نے مدینۂ طیبہ پر چھاپا مارنے کی تیاریاں کیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی روک تھام کے لیے سریۂ ابو سلمہ بھیجنا پڑا۔ پھر صفر ۴ھ میں عَضَل اور قارَہ نے حضورؐ سے چند آدمی مانگے تاکہ وہ ان کے علاقے میں جا کر لوگوں کو دینِ اسلام کی تعلیم دیں۔ حضورؐ نے چھ اصحاب کو ان کے ساتھ کر دیا۔ مگر رجیع (جدہ اور رابغ کے درمیان) پہنچ کر وہ لوگ قبیلۂ ہُذَیل کے کفار کو ان بے بس مبلغین پر چڑھا لائے، ان میں سے چار کو قتل کر دیا، اور دو صاحبوں (حضرت خُبَیب بن عدی اور حضرت زید بن الدَّثِنَہ) کو لے جا کر مکہ معظمہ میں دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ پھر اسی ماہ صفر میں بنی عامر کے ایک

سردار کی درخواست پر حضورؐ نے ایک ۔ اور تبلیغی وفد ، جو چالیس (یا بقول بعض ۷۰) انصاری نوجوانوں پر مشتمل تھا ، نجد کی طرف ۔ روانہ کیا ۔ مگر ان کے ساتھ بھی غداری کی گئی اور بنی سُلَیم کے قبائل عُصَیّہ اور رِعْل اور ذکوان نے بئرِ مَعُونہ کے مقام پر اچانک نرغہ کر کے ان سب ۔ کو قتل کر دیا ۔ اسی دوران میں مدینے کا یہودی قبیلہ بنی النّضیر دلیر ہو کر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا ، یہاں تک کہ ربیع الاول ۴ھ میں اس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کی سازش تک کر ڈالی ۔ پھر جمادی الاولیٰ ۴ھ میں بنی غطفان کے دو قبیلوں ، بنو ثعلبہ اور بنو محارب نے مدینہ پر حملے کی تیاریاں کیں اور حضورؐ کو خود ان کی روک تھام کے لیے جانا پڑا ۔ اس طرح جنگِ احد کی شکست سے جو ہوا اکھڑی تھی وہ مسلسل سات آٹھ مہینے تک ۔ اپنا رنگ ۔ دکھاتی رہی ۔

لیکن وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم و تدبر اور صحابہ کرام کا جذبۂ فداکاری تھا جس نے تھوڑی مدت کے اندر ہی حالات کا رخ بدل کر رکھ دیا ۔ عربوں کے معاشی مقاطعہ نے اہلِ مدینہ کے لیے جینا دشوار کر رکھا تھا ۔ گرد و پیش کے تمام مشرک قبائل جری و دست ہو رہے تھے ۔ خود مدینے کے اندر یہود اور منافقین مارِ آستین بنے ہوئے تھے ۔ مگر ان مٹھی بھر مومنین صادقین نے رسولِ خدا کی قیادت میں پے در پے ایسے اقدامات کیے جن سے عرب میں اسلام کا رعب صرف بحال ہی نہیں ہو گیا بلکہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ۔

جنگ احزاب سے پہلے کے غزوات ان میں سے اولین اقدام وہ تھا جو جنگِ احد کے فوراً ہی بعد کیا گیا ۔ جنگ کے ٹھیک دوسرے روز ، جبکہ بکثرت مسلمان زخمی تھے اور بہت سے گھروں میں عزیز ترین اقارب کی شہادت پر کہرام برپا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی زخمی اور حضرت حمزہ کی شہادت پر دلفگار تھے ۔ حضورؐ نے اسلام کے فدائیوں کو پکارا کہ لشکرِ کفار کے تعاقب میں چلنا ہے تاکہ وہ کہیں راستے سے پلٹ کر پھر مدینے پر حملہ آور نہ ہو جائیں ۔ حضورؐ کا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا کہ کفارِ قریش ہاتھ آئی ہوئی فتح کا کوئی فائدہ اٹھائے بغیر واپس تو چلے گئے ہیں ، لیکن وہ راستے میں جب کسی جگہ جا کر ٹھیریں گے تو اپنی اس حماقت پر نادم ہوں گے اور دوبارہ مدینے پر چڑھ آئیں گے ۔ اس بنا پر آپ نے ان کے

تعاقب کا فیصلہ کیا اور فوراً ۶۳۰ جاں نثار آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مکہ کے راستے میں جب حمراء الاسد پہنچ کر آپ نے تین روز تک پڑاؤ کیا تو ایک ہمدرد غیر مسلم کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ ابوسفیان اپنے ۲۹۷۸ آدمیوں کے ساتھ مدینے سے ۳۶ میل دور الروحاء کے مقام پر ٹھیرا ہوا تھا اور یہ لوگ فی الواقع اپنی غلطی کو محسوس کر کے پھر پلٹ آنا چاہتے تھے، لیکن یہ سن کر ان کی ہمت ٹوٹ گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لشکر لیے ہوئے ان کے تعاقب میں چلے آ رہے ہیں۔ اس کارروائی کا صرف یہی فائدہ نہیں ہوا کہ قریش کے بڑھے ہوئے حوصلے پست ہو گئے، بلکہ گرد و پیش کے دشمنوں کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی قیادت ایک انتہائی بیدار مغز اور اولوالعزم ہستی کر رہی ہے اور مسلمان اس کے اشارے پر کٹ مرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، صفحات ۲۲۹-۲۳۰-۳۰۳)

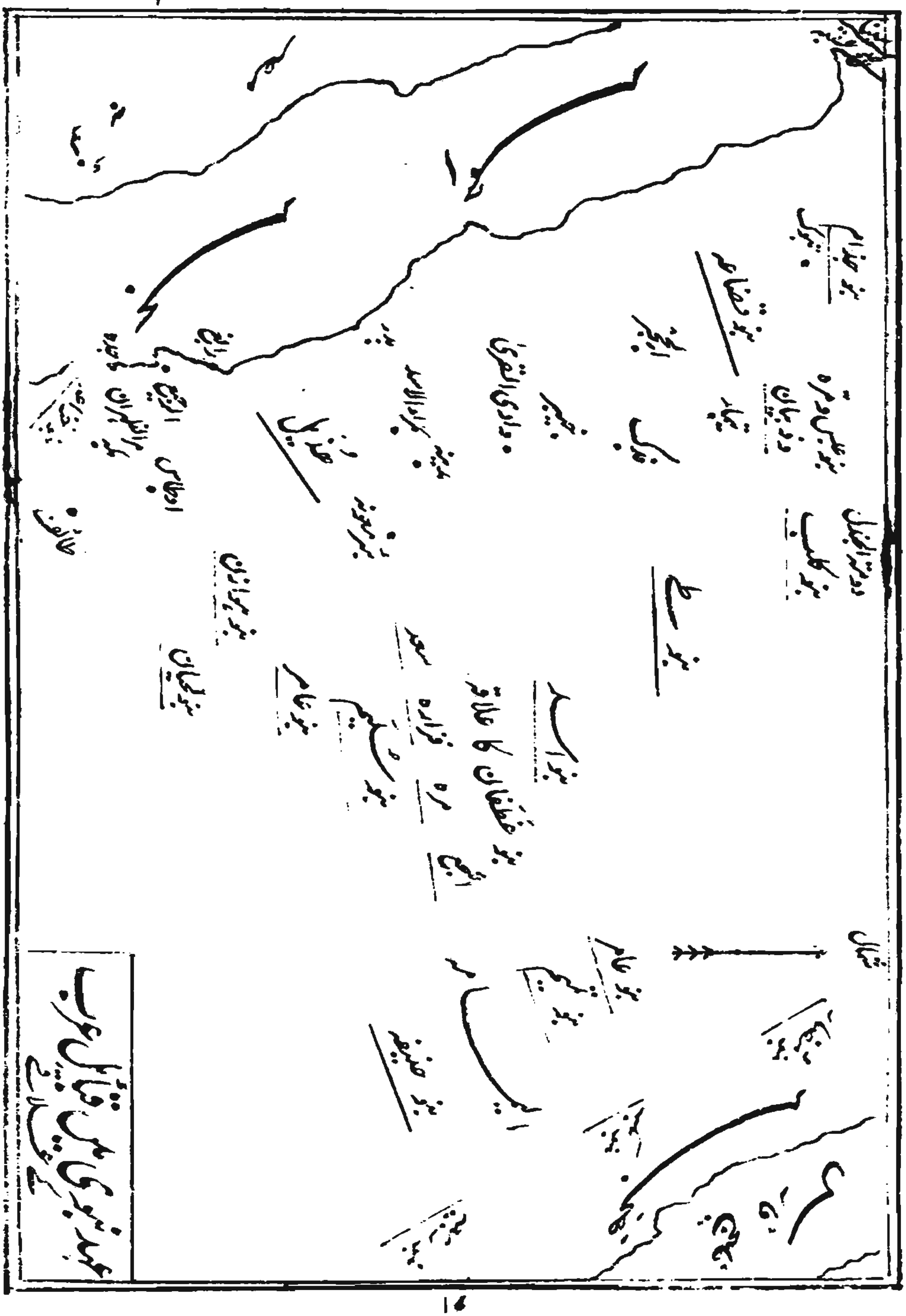
پھر جونہی کہ بنی اسد نے مدینے پر چھاپہ مارنے کی تیاریاں شروع کیں، حضورؐ کے مخبروں نے بروقت آپ کو ان کے ارادوں سے باخبر کر دیا۔ قبل اس کے کہ وہ چڑھ کر آتے، آپ نے حضرت ابوسلمہ (ام المومنین حضرت ام سلمہ کے پہلے شوہر) کی قیادت میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا ایک لشکر ان کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔ یہ فوج اچانک ان کے سر پہ پہنچ گئی۔ بدحواسی کے عالم میں وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کا سارا مال اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔

اس کے بعد بنی النضیر کی باری آئی۔ جس روز انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی اور اس کا راز فاش ہوا اُسی روز آپ نے ان کو نوٹس دے دیا کہ دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جاؤ، اس کے بعد تم میں سے جو یہاں پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا۔ منافقین مدینہ کے سردار عبداللہ بن اُبی نے ان کو شہ دی کہ ڈٹ جاؤ اور مدینہ چھوڑنے سے انکار کر دو، میں دو ہزار آدمیوں کے ساتھ تمہاری مدد کروں گا، بنی قریظہ تمہاری مدد کریں گے، نجد سے بنی غطفان بھی تمہاری مدد کے لیے آئیں گے۔ ان باتوں میں آ کر انہوں نے حضورؐ کو کہلا بھیجا کہ ہم اپنا علاقہ نہیں چھوڑیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے۔ حضورؐ نے نوٹس کی میعاد ختم ہوتے ہی ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے

حامیوں میں سے کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ مدد کو آتا۔ آخر کار انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیئے کہ ان میں سے ہر تین آدمی ایک اونٹ پر جو کچھ لاد کر لے جاسکتے ہیں لے جائیں گے اور باقی سب کچھ مدینہ ہی میں چھوڑ جائیں گے۔ اس طرح مضافاتِ مدینہ کا وہ پورا محلہ جس میں بنی نضیر رہتے تھے، ان کے باغات اور گڑھیوں اور سروسامان سمیت مسلمانوں کے ہاتھ آگیا اور اس بدعہد قبیلے کے لوگ خیبر، وادی القریٰ اور شام میں تتر بتر ہو گئے۔

پھر آپ نے بنی غطفان کی طرف توجہ کی جو مدینے پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ آپ چار سو کا لشکر لے کر نکلے اور ذات الرّقاع کے مقام پر ان کو جالیا۔ اس اچانک حملے نے ان کے حواس باختہ کر دیئے اور کسی جنگ کے بغیر وہ اپنے گھر بار اور مال اسباب چھوڑ کر پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔

اس کے بعد شعبان ۴ھ میں آپ ابوسفیان کے اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے نکلے جو اس نے اُحد سے پلٹتے ہوئے دیا تھا۔ خاتمۂ جنگ پر اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف رُخ کر کے اعلان کیا تھا کہ ان موعدکم بدر للعام المقبل (آئندہ سال بدر کے مقام پر ہمارا تمہارا پھر مقابلہ ہوگا)۔ اور حضورؐ نے جواب میں ایک صحابی کے ذریعہ سے یہ اعلان کرادیا تھا کہ نعم، ھی بیننا وبینک موعد (ٹھیک ہے، یہ بات ہمارے اور تیرے درمیان طے ہوگئی)۔ اس قرارداد کے مطابق طے شدہ وقت پر آپ ۱۵ سو صحابیوں کو لے کر بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ اُدھر سے ابوسفیان دو ہزار کا لشکر لیکر چلا مگر مرّ الظّہران (موجودہ وادی فاطمہ) سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ حضورؐ نے بدر میں آٹھ دن اس کا انتظار کیا اور اس دوران میں مسلمان تجارت کر کے ایک درہم کے دو درہم کماتے رہے۔ اس واقعہ سے وہ دھاک جو اُحد میں اکھڑ گئی تھی پہلے سے بھی زیادہ جم گئی۔ اس نے پورے عرب پر یہ بات کھول دی کہ اب تنہا قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۳۰۲)۔

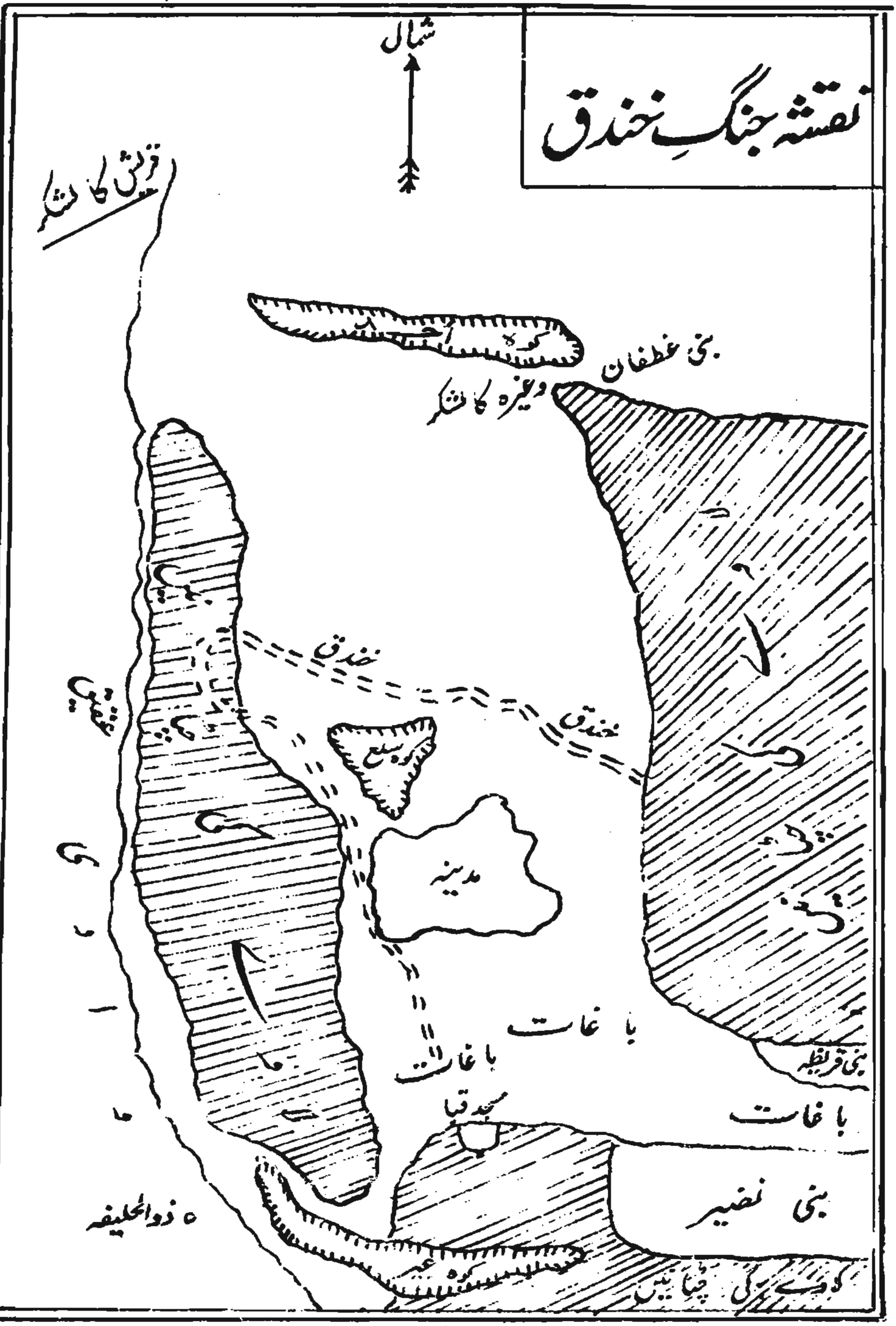

عہد نبوی میں قبائل عرب
کے علاقے
شمال
خلیج فارس
دومۃ الجندل
بنو کلب
بنو عبس و مرہ
و ذبیان
بنو جذام
تبوک
بنو قضاعہ
تیماء
الحجر
فدک
خیبر
وادی القریٰ
بنو طے
بنو اسد
بنو غطفان کا علاقہ
اشجع
مرہ
فزارہ
سعد
بنو سُلَیم
بنو عامر
بنو عامر
بنو تمیم
الیمامہ
بنو حنیفہ
مدینہ
حمراء الاسد
بدر
بئر معونہ
ہُذَیل
بنو ہوازن
بنو لحیان
رابغ
الرجیع
اوطاس
مر الظہران
مکہ
جدہ
طائف

اس دھاک میں ایک اور واقعہ نے مزید اضافہ کیا۔ عرب اور شام کی سرحد پر دُومۃ الجندل (موجودہ الجوف)، ایک اہم مقام تھا جہاں سے عراق اور مصر و شام کے درمیان عرب کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس مقام کے لوگ قافلوں کو تنگ کرتے اور اکثر لوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول ۵ھ میں ایک ہزار کا لشکر لیکر ان کی تادیب کے لیے خود تشریف لے گئے۔ وہ آپ کے مقابلے کی ہمت نہ کر سکے اور بستی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس سے پورے شمالی عرب پر اسلام کی ہیبت بیٹھ گئی اور قبائل نے یہ سمجھ لیا کہ مدینے میں جو زبردست طاقت پیدا ہوئی ہے اس کا مقابلہ اب ایک دو قبیلوں کے بس کا کام نہیں ہے۔

غزوۂ احزاب یہ حالات تھے جن میں غزوۂ احزاب پیش آیا۔ یہ غزوہ دراصل عرب کے بہت سے قبائل کا ایک مشترک حملہ تھا جو مدینے کی اِس طاقت کو کچل دینے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی تحریک بنی النَّضِیر کے اُن لیڈروں نے کی تھی جو مدینے سے جلاوطن ہو کر خیبر میں مقیم ہو گئے تھے۔ انھوں نے دورہ کر کے قریش اور غَطَفان اور ہُذَیل اور دوسرے بہت سے قبائل کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سب مل کر بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مدینے پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے شوال ۵ھ میں قبائلِ عرب کی اتنی بڑی جمعیت اس چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہو گئی جو اس سے پہلے عرب میں کبھی جمع نہ ہوئی تھی۔ اس میں شمال کی طرف سے بنی النَّضِیر اور بنی قَینُقاع کے وہ یہودی آئے جو مدینے سے جلاوطن ہو کر خیبر اور وادی القریٰ میں آباد ہوئے تھے۔ مشرق کی طرف سے غَطَفان کے قبائل (بنو سُلَیم، فَزارہ، مُرّہ، اَشجع، سعد اور اسد وغیرہ) نے پیش قدمی کی۔ اور جنوب کی طرف سے قریش اپنے حلیفوں کی ایک بھاری جمعیت لیکر آگے بڑھے۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد دس بارہ ہزار تھی۔

یہ حملہ اگر اچانک ہوتا تو سخت تباہ کن ہوتا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینۂ طیبہ میں بے خبر بیٹھے ہوئے نہ تھے بلکہ آپ کے خبر رساں اور تحریکِ اسلامی کے ہمدرد اور متاثرین جو تمام قبائل میں موجود تھے، آپ کو دشمنوں کی نقل و حرکت سے برابر مطلع کرتے رہتے تھے[1]۔ قبل

[1] یہ قوم پرست جتھوں کے مقابلے میں ایک نظریاتی تحریک کی فوقیت کا ایک اہم سبب ہوتا ہے۔ قوم پرست جتھے صرف ۴



نقشہ جنگِ خندق
شمال
قریش کا لشکر
کوہِ اُحد
بنی غطفان وغیرہ کا لشکر
خندق
خندق
کوہِ سلع
مدینہ
باغات
باغات
باغات
بنی قریظہ
مسجد قبا
بنی نضیر
ذوالحلیفہ
کوہِ عیر

اس کے کہ یہ جمِ غفیر آپ کے شہر پر پہنچتا، آپ نے چھ دن کے اندر مدینہ کے شمال غربی رخ پر ایک خندق کھدوالی، اور کوہ سَلَع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ مدینہ کے جنوب میں باغات اس کثرت سے تھے (اور اب بھی ہیں) کہ اس جانب سے کوئی حملہ اس پر نہ ہو سکتا تھا۔ مشرق میں حرّات (لاوے کی چٹانیں) ہیں جن پر سے کوئی اجتماعی فوج کشی آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت مغربی جنوبی گوشے کی بھی ہے۔ اس لیے حملہ صرف اُحُد کے مشرقی اور مغربی گوشوں سے ہو سکتا تھا اور اسی جانب حضورؐ نے خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا تھا۔ یہ چیز سرے سے کفار کے جنگی نقشے میں تھی ہی نہیں کہ انہیں مدینے کے باہر خندق سے سابقہ پیش آئے گا، کیونکہ اہلِ عرب اس طریقِ دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انہیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہ آئے تھے۔

اس کے بعد کفار کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ گئی تھی، اور وہ یہ کہ بنی قریظہ کے یہودی قبیلے کو غداری پر آمادہ کریں جو مدینۂ طیبہ کے جنوب مشرقی گوشے میں رہتا تھا۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ تھا جس کی رُو سے مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کرنے کا پابند تھا، اس لیے مسلمانوں نے اس طرف سے بے فکر ہو کر اپنے بال بچے اُن گڑھیوں میں بھجوا دیے تھے جو بنی قریظہ کی جانب تھیں اور اُدھر مدافعت کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ کفار نے اسلامی دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا۔ اُن کی طرف سے بنی النضیر کا یہودی سردار حُیَیّ بن اَخْطَب بنی قریظہ کے پاس بھیجا گیا تا کہ انہیں معاہدہ توڑ کر جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کرے۔ ابتداءً انہوں نے اس سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ ہے اور آج تک کبھی ہمیں

م۔ اپنی قوم کے افراد کی تائید و حمایت ہی پر انحصار رکھتے ہیں لیکن ایک اصولی و نظریاتی تحریک اپنی دعوت ہر سمت میں بڑھتی ہے اور خود ان جتھوں کے اندر سے اپنے حامی نکال لاتی ہے۔

اُن سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن جب ابن اخطب نے ان سے کہا کہ "دیکھو، میں اس وقت عرب کی متحدہ طاقت اِس شخص پر چڑھا لایا ہوں، یہ اسے ختم کر دینے کا نادر موقع ہے، اس کو اگر تم نے کھو دیا تو پھر دوسرا کوئی موقع نہ مل سکے گا"، تو یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اخلاق کے پاس و لحاظ پر غالب آگئی اور بنی قریظہ عہد توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے سے بھی بے خبر نہ تھے۔ آپ کو بروقت، اس کی اطلاع مل گئی اور آپ نے فوراً انصار کے سرداروں (سعد بن عُبادہ، سعد بن مُعاذ، عبداللہ بن رواحہ اور خوات بن جُبیر) کو ان کے پاس تحقیقِ حال اور فہمائش کے لیے بھیجا۔ چلتے وقت آپ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اگر بنی قریظہ عہد پر قائم رہیں تو آکر سارے لشکر کے سامنے علی الاعلان یہ خبر سنا دینا۔ لیکن اگر وہ نقضِ عہد پر مصر ہوں تو صرف مجھ کو اشارۃً اس کی اطلاع دے دینا تاکہ عام مسلمان یہ بات سُن کر پست ہمت نہ ہو جائیں۔ یہ حضرات وہاں پہنچے تو بنی قریظہ کو پوری خباثت پر آمادہ پایا اور انہوں نے برملا اِن سے کہہ دیا کہ لاعقد بیننا و بین محمد و لا عہد۔ "ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہے"۔ اِس جواب کو سُن کر وہ لشکرِ اسلام میں واپس آئے اور اشارۃً حضورؐ سے عرض کر دیا: عَضَل و قَارہ۔ یعنی قبیلہ عضل و قارہ نے رَجیع کے مقام پر مبلغینِ اسلام کے وفد سے جو غداری کی تھی، وہی کچھ اب بنی قریظہ کر رہے ہیں۔

یہ خبر بہت جلدی مدینہ کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان کے اندر اس سے سخت اضطراب پیدا ہو گیا، کیونکہ اب وہ دونوں طرف سے گھیرے میں آگئے تھے اور ان کے شہر کا وہ حصہ خطرے میں پڑ گیا تھا جدھر دفاع کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اور سب کے بال بچے بھی اسی جانب تھے۔ اس پر منافقین کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں اور انہوں نے اہلِ ایمان کے حوصلے پست کرنے کے لیے طرح طرح کے نفسیاتی حملے شروع کر دیئے۔ کسی نے کہا کہ "ہم سے وعدے تو قیصر و کسریٰ کے ملک فتح ہو جانے کے کیے جا رہے تھے، اور حال یہ ہے کہ ہم رفعِ حاجت کے لیے بھی نہیں نکل سکتے"۔ کسی نے یہ کہہ کر خندق کے محاذ سے رخصت مانگی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں،

ہمیں جاکر ان کی حفاظت کرنی ہے۔ کسی نے یہاں تک خفیہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حملہ آوروں سے اپنا معاملہ درست کر لو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے کر دو۔ یہ ایسی شدید آزمائش کا وقت تھا جس میں ہر اس شخص کا پردہ فاش ہو گیا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی نفاق موجود تھا۔ صرف صادق و مخلص اہل ایمان ہی تھے جو اس کڑے وقت میں بھی فدا کاری کے عزم پر ثابت قدم رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک موقع پر بنی غطفان سے صلح کی بات چیت شروع کی اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ مدینہ کے پھلوں کی پیداوار کا ⅓ حصہ لے کر واپس چلے جائیں لیکن جب انصار کے سرداروں (سعدؓ بن عبادہ اور سعدؓ بن معاذ) سے آپ نے ان شرائط صلح کے متعلق مشورہ طلب کیا تو انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ، یہ آپ کی خواہش ہے کہ ہم ایسا کریں؟ یا یہ اللہ کا حکم ہے کہ ہمارے لیے اسے قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے؟ یا آپ صرف ہمیں بچانے کے لیے یہ تجویز فرما رہے ہیں؟" آپ نے جواب دیا "میں صرف تم لوگوں کو بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سارا عرب متحد ہو کر تم پر پل پڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کو ایک دوسرے سے توڑ دوں"۔ اس پر دونوں سرداروں نے بالاتفاق کہا کہ "اگر آپ ہماری خاطر یہ معاہدہ کر رہے ہیں تو اسے ختم کر دیجیے۔ یہ قبیلے ہم سے اُس وقت بھی ایک حبہ خراج کے طور پر کبھی نہ لے سکے تھے جب کہ ہم مشرک تھے، اور اب تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا شرف ہمیں حاصل ہے۔ کیا اب یہ ہم سے خراج لیں گے؟ ہمارے اور ان کے درمیان اب صرف تلوار ہے، یہاں تک کہ اللہ ہمارا اور ان کا فیصلہ کر دے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے معاہدے کے اس مسودے کو چاک کر دیا جس پر ابھی فریقین کے دستخط نہ ہوئے تھے۔

اسی دوران میں قبیلۂ غطفان کی شاخ اشجع کے ایک صاحب نُعیم بن مسعود مسلمان ہو کر حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابھی تک کسی کو بھی میرے قبول اسلام کا علم نہیں ہے، آپ مجھ سے اس وقت جو خدمت لینا چاہیں میں اسے انجام دے سکتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا تم جا کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی تدبیر کرو۔[1] چنانچہ وہ پہلے بنی قریظہ کے پاس گئے جن سے ان کا بہت

---

[1] اسی موقع پر حضورؐ نے فرمایا تھا الحرب خدعة۔ یعنی جنگ میں دھوکہ دینا جائز ہے۔

میل جول تھا، اور ان سے کہا کہ قریش اور غطفان تو محاصرے سے تنگ آکر واپس بھی جا سکتے ہیں، ان کا کچھ نہ بگڑے گا، مگر تمہیں مسلمانوں کے ساتھ اسی جگہ رہنا ہے، وہ لوگ اگر چلے گئے تو تمہارا کیا بنے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اس وقت تک جنگ میں حصہ نہ لو جب تک ان باہر سے آئے ہوئے قبائل کے چند نمایاں آدمی تمہارے پاس یرغمال کے طور پر نہ بھیج دیئے جائیں۔ یہ بات بنی قریظہ کے دل میں اتر گئی اور انہوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یرغمال طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ بنی قریظہ کچھ ڈھیلے پڑتے نظر آ رہے ہیں، بعید نہیں کہ وہ تم سے یرغمال کے طور پر کچھ آدمی مانگیں اور انہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر کے اپنا معاملہ صاف کر لیں۔ اس لیے ذرا ان کے ساتھ ہوشیاری سے معاملہ کرنا۔ اس سے متحدہ محاذ کے لیڈر بنی قریظہ کی طرف سے کھٹک گئے اور انہوں نے قرظی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ اس طویل محاصرے سے اب ہم تنگ آ گئے ہیں، اب ایک فیصلہ کن لڑائی ہو جانی چاہیے۔ کل تم اُدھر سے حملہ کرو اور ہم اِدھر سے یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بنی قریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ لوگ جب تک اپنے چند نمایاں آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے حوالہ نہ کر دیں، ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس جواب سے متحدہ محاذ کے لیڈروں کو یقین آ گیا کہ نعیم کی بات سچی تھی۔ انہوں نے یرغمال دینے سے انکار کر دیا اور اس سے بنی قریظہ نے سمجھ لیا کہ نعیم نے ہم کو ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ اس طرح یہ جنگی چال بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے دشمنوں کے کیمپ میں پھوٹ ڈال دی۔

اب محاصرہ ۲۵ دن سے زیادہ طویل ہو چکا تھا۔ سردی کا زمانہ تھا۔ اتنے بڑے لشکر کے لیے پانی اور غذا اور چارے کی فراہمی بھی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھوٹ پڑ جانے سے بھی محاصرین کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اس حالت میں یکایک ایک رات سخت آندھی آئی جس میں سردی اور کڑک اور چمک تھی اور اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھائی دیتا تھا۔ آندھی کے زور سے دشمنوں کے خیمے الٹ گئے اور ان کے اندر شدید افراتفری برپا ہو گئی۔ قدرت خداوندی

کا یہ کاری وار وہ نہ سہہ سکے۔ راتوں رات ہر ایک نے اپنے گھر کی راہ لی اور صبح جب مسلمان اٹھے تو میدان میں ایک دشمن بھی موجود نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان کو دشمنوں سے خالی دیکھ کر فوراً ارشاد فرمایا لن تغزوکم قریش بعد عامکم ھٰذا ولٰکنکم تغزونھم۔ یعنی "اب قریش کے لوگ تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے۔ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے"۔ یہ حالات کا بالکل صحیح اندازہ تھا۔ قریش ہی نہیں، سارے دشمن قبائل متحد ہو کر اسلام کے خلاف اپنا آخری داؤں چل چکے تھے اس میں ہار جانے کے بعد اب ان میں یہ ہمت ہی باقی نہ رہی تھی کہ مدینے پر حملہ آور ہونے کی جرأت کر سکتے۔ اب حملے (OFFENSIVE) کی قوت دشمنوں سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔

غزوۂ بنی قریظہ

خندق سے پلٹ کر جب حضور گھر پہنچے تو ظہر کے وقت جبریل نے آکر حکم سنایا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولے جائیں، بنی قریظہ کا معاملہ باقی ہے، ان سے بھی اسی وقت نمٹ لینا چاہیے۔ یہ حکم پاتے ہی حضور نے فوراً اعلان فرمایا کہ "جو کوئی سمع وطاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیارِ بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے"۔ اس اعلان کے ساتھ ہی آپ نے حضرت علیؓ کو ایک دستے کے ساتھ مقدمۃ الجیش کے طور پر بنی قریظہ کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ جب وہاں پہنچے تو یہودیوں نے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی لیکن یہ بدزبانی اُن کو اِس جرمِ عظیم کے خمیازے سے کیسے بچا سکتی تھی کہ انہوں نے عین لڑائی کے وقت معاہدہ توڑ ڈالا اور حملہ آوروں سے مل کر مدینے کی پوری آبادی کو ہلاکت کے خطرے میں مبتلا کر دیا۔ حضرت علیؓ کے دستے کو دیکھ کر وہ سمجھے تھے کہ یہ محض دھمکانے آئے ہیں۔ لیکن جب حضورؐ کی قیادت میں پورا اسلامی لشکر وہاں پہنچ گیا اور ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا گیا تو اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ محاصرے کی شدت کو وہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کر سکے اور آخرکار انہوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا کہ قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی کر دیں گے اسے فریقین مان لیں گے۔ انہوں نے حضرت سعد کو اس امید پر حَکَم بنایا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں اوس اور بنی قریظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات

مدتوں سے چلے آرہے تھے وہ ان کا لحاظ کریں گے اور انہیں بھی اسی طرح مدینہ سے نکل جانے دیں گے جس طرح پہلے بنی قینقاع اور بنی النضیر کو نکل جانے دیا گیا تھا۔ خود قبیلۂ اوس کے لوگ بھی حضرت سعدؓ سے تقاضا کر رہے تھے کہ اپنے حلیفوں کے ساتھ نرمی برتیں۔ لیکن حضرت سعدؓ ابھی ابھی دیکھ چکے تھے کہ پہلے جن دو یہودی قبیلوں کو نکلنے کا موقع دیا گیا تھا وہ کس طرح سارے گرد و پیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینے پر دس بارہ ہزار کا لشکر چڑھا لائے تھے۔ اور یہ معاملہ بھی ان کے سامنے تھا کہ اس آخری یہودی قبیلے نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بدعہدی کر کے اہلِ مدینہ کو تباہ کر دینے کا کیا سامان کیا تھا۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ دیا کہ بنی قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیئے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، اور ان کے تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا اور جب بنی قریظہ کی گڑھیوں میں مسلمان داخل ہوئے تو انہیں پتہ چلا کہ جنگِ احزاب میں حصہ لینے کے لیے اِن غداروں نے ۱۵۰۰ تلواریں تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے، اور ۱۵۰۰ ڈھالیں فراہم کی تھیں۔ اگر اللہ کی تائید مسلمانوں کے شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ سارا جنگی سامان عین اُس وقت مدینہ پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا جبکہ مشرکین یکبارگی خندق پار کر کے ٹوٹ پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس انکشاف کے بعد تو اس امر میں شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی کہ حضرت سعدؓ نے ان لوگوں کے معاملہ میں جو فیصلہ دیا وہ بالکل حق تھا۔

<u>معاشرتی اصلاحات</u> | جنگِ احد اور جنگِ احزاب کے درمیان، دو سال کا یہ زمانہ اگرچہ ایسے ہنگاموں کا زمانہ تھا جن کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو ایک دن کے لیے بھی امن اور اطمینان نصیب نہ ہوا، لیکن اس پوری مدت میں نئے مسلم معاشرے کی تعمیر، اور ہر پہلو میں زندگی کی اصلاح کا کام برابر جاری رہا۔ یہی زمانہ تھا جس میں مسلمانوں کے قوانینِ نکاح و طلاق قریب قریب مکمل ہو گئے، وراثت کا قانون بنا، شراب اور جوئے کو حرام کیا گیا، اور معیشت و معاشرت کے دوسرے بہت سے پہلوؤں میں نئے ضابطے نافذ کیے

اس سلسلے کا ایک اہم مسئلہ جو اصلاح کا تقاضا کر رہا تھا تبنیت کا مسئلہ تھا عرب کے لوگ جس بچے کو متبنّٰی بنا لیتے تھے وہ بالکل ان کی حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اسے وراثت ملتی تھی اس سے منہ بولی ماں اور منہ بولی بہنیں وہی خلا ملا رکھتی تھیں جو حقیقی بیٹے اور بھائی سے رکھا جاتا ہے اس کے ساتھ منہ بولے باپ کی بیٹیوں کا اور اس باپ کے مر جانے کے بعد اس کی بیوہ کا نکاح اسی طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا جس طرح سگی بہن اور حقیقی ماں کے ساتھ کسی کا نکاح حرام ہوتا ہے اور یہی معاملہ اس صورت میں بھی کیا جاتا تھا جب منہ بولا بیٹا مر جائے یا اپنی بیوی کو طلاق دیدے۔ منہ بولے باپ کے لیے وہ عورت سگی بہو کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ یہ رسم قدم قدم پر نکاح اور طلاق اور وراثت کے اُن قوانین سے ٹکراتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں مقرر فرمائے تھے۔ اُن کی رُو سے جو لوگ حقیقت میں وراثت کے حق دار تھے یہ رسم ان کا حق مار کر ایک ایسے شخص کو دلواتی تھی جو سرے سے کوئی حق نہ رکھتا تھا۔ اُن کی رُو سے جن عورتوں اور مردوں کے درمیان رشتہ نکاح حلال تھا، یہ رسم ان کے باہمی نکاح کو حرام کرتی تھی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلامی قانون جن بد اخلاقیوں کا سدِّ باب کرنا چاہتا تھا، یہ رسم ان کے پھیلنے میں مددگار تھی۔ کیونکہ رسم کے طور پر منہ بولے رشتے میں خواہ کتنا ہی تقدس پیدا کر دیا جاتے، بہرحال منہ بولی ماں، منہ بولی بہن اور منہ بولی بیٹی حقیقی ماں بہن اور بیٹی کی طرح نہیں ہوسکتی۔ ان مصنوعی رشتوں کے رسمی تقدس پر بھروسہ کر کے مردوں اور عورتوں کے درمیان جب حقیقی رشتہ داروں کا سا خلا ملا ہو تو وہ بُرے نتائج پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان وجوہ سے اسلامی قانونِ نکاح و طلاق، قانونِ وراثت اور قانونِ حرمتِ زنا کا یہ تقاضا تھا کہ متبنّٰی کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھنے کے تخیل کا قطعی استیصال کر دیا جائے۔

لیکن یہ تخیل محض ایک قانونی حکم کے طور پر یہ بیان کر دینے سے ختم نہیں ہو سکتا تھا کہ "منہ بولا رشتہ کوئی حقیقی رشتہ نہیں ہے"۔ صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات اور اوہام محض اقوال سے نہیں بدل جاتے حکماً لوگ اس بات کو مان بھی لیتے کہ یہ رشتے حقیقی رشتے نہیں ہیں، پھر

بھی منہ بولی ماں اور منہ بولے بیٹے کے درمیان، منہ بولے بھائی اور بہن کے درمیان، منہ بولے باپ اور بیٹی کے درمیان، منہ بولے خسر اور بہو کے درمیان نکاح کو لوگ مکروہ ہی سمجھتے رہتے۔ نیز ان کے مابین خلا ملا بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا۔ اس لیے ناگزیر تھا کہ یہ رسم عملاً توڑی جائے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس اس کو توڑیں۔ کیونکہ جو کام حضورؐ نے خود کیا ہو، اور اللہ کے حکم سے کیا ہو، اس کے متعلق کسی مسلمان کے ذہن میں کراہت کا تصور باقی نہ رہ سکتا تھا۔ اسی بنا پر جنگِ احزاب سے کچھ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ کیا گیا کہ آپ اپنے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مطلقہ بیوی سے خود نکاح کر لیں، اور اس حکم کی تعمیل آپ نے محاصرۂ بنی قریظہ کے زمانے میں فرمائی۔ (غالباً تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ عدت ختم ہونے کا انتظار تھا، اور اسی دوران میں جنگی مصروفیات پیش آگئی تھیں)۔

نکاحِ زینب پر پروپیگنڈے کا طوفان یہ کام ہونا تھا کہ حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔ مشرکین اور منافقین اور یہود سب آپ کی پے درپے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے۔ اُحد کے بعد سے احزاب اور بنی قریظہ تک دو سال کی مدت میں جس طرح وہ زک پر زک اٹھاتے چلے گئے تھے اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں آگ لگ رہی تھی۔ وہ اس بات سے بھی مایوس ہو چکے تھے کہ اب وہ کھلے میدان میں لڑ کر کبھی آپ کو زیر کر سکیں گے۔ اس لیے انہوں نے اس نکاح کے معاملے کو اپنے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ اب ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُس اخلاقی برتری کو ختم کر سکیں گے جو اُن کی طاقت اور اُن کی کامیابیوں کا اصل راز ہے۔ چنانچہ یہ افسانے تراشے گئے کہ (معاذ اللہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہو کو دیکھ کر عاشق ہو گئے تھے، بیٹے کو اس تعلقِ خاطر کا علم ہو گیا، اس نے بیوی کو طلاق دے دی اور باپ نے اس کے بعد بہو سے بیاہ رچا لیا۔ حالانکہ یہ بات صریحاً لغو تھی۔ حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ بچپن سے جوانی تک ان کی ساری عمر آپ کے سامنے گذری تھی۔ کسی وقت ان کو دیکھ کر عاشق ہو جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ پھر آپ نے خود اصرار کر کے حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح کرایا تھا۔ ان کا

سارا خاندان اس پر راضی نہ تھا کہ قریش کے اتنے اونچے گھرانے کی لڑکی ایک آزاد کردہ غلام سے بیاہی جائے خود حضرت زینب بھی اس رشتے سے ناخوش تھیں، مگر حضورؐ کے حکم سے سب مجبور ہو گئے، اور حضرت زید کے ساتھ ان کی شادی کر کے عرب میں اس امر کی پہلی مثال پیش کر دی گئی کہ اسلام ایک آزاد کردہ غلام کو اٹھا کر شرفائے قریش کے برابر لے آیا ہے۔ اگر فی الواقع حضورؐ کا کوئی میلان حضرت زینبؓ کی جانب ہوتا تو زید بن حارثہ سے ان کا نکاح کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، آپ خود ان سے نکاح کر سکتے تھے۔ لیکن بے حیا مخالفین نے ان سارے حقائق کے موجود ہوتے یہ عشق کے افسانے تصنیف کیے، خوب نمک مرچ لگا لگا کر ان کو پھیلایا اور اس پروپیگنڈے کا صور اس زور سے پھونکا کہ خود مسلمانوں کے اندر بھی ان کی گھڑی ہوئی روایات پھیل گئیں۔

پردہ کے ابتدائی احکام یہ بات کہ دشمنوں کے تصنیف کیے ہوئے یہ افسانے مسلمانوں کی زبانوں پر چڑھنے سے بھی نہ رکے اِس امر کی کھلی ہوئی علامت تھی کہ معاشرے میں شہوانیت کا عنصر حدِ اعتدال سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ خرابی اگر موجود نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ذہن ایسی پاک ہستی کے متعلق ایسے بے سروپا اور اس قدر گھناؤنے افسانوں کی طرف ادنیٰ التفات بھی کرتے، کجا کہ زبانیں ان کو دہرانے لگتیں۔ یہ ٹھیک موقع تھا جبکہ اسلامی معاشرے میں اُن اصلاحی احکام کے نفاذ کی ابتدا کی گئی جو "حجاب" (پردے) کے عنوان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ اِن اصلاحات کا آغاز اس سورے سے کیا گیا، اور ان کی تکمیل ایک سال بعد سورۂ نور میں کی گئی، جبکہ حضرت عائشہ پر بہتان کا فتنہ کھڑا ہوا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ نور، دیباچہ)

حضورؐ کی خانگی زندگی کے معاملات اسی زمانہ میں دو مسئلے اور بھی توجہ طلب تھے۔ اگرچہ بظاہر ان کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی سے تھا، مگر جو ذات اپنی جان خدا کے دین کو پروان چڑھانے کے لیے کھپا رہی تھی اور ہمہ تن اِس کارِ عظیم میں منہمک تھی اُس کے لیے خانگی زندگی کا سکون فراہم کرنا، اور اُس کو پریشانیوں سے بچانا، اور اس کو لوگوں کے شکوک و شبہات سے محفوظ رکھنا بھی خود دین ہی کے مفاد کے لیے ضروری تھا۔

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مالی حیثیت سے انتہائی تنگ حال تھے۔ ابتدائی

چار سال تک تو آپ کا کوئی ذریعۂ آمدنی تھا ہی نہیں ۔ سنہ ۴ھ میں بنی النضیر کی جلاوطنی کے بعد ان کی متروکہ زمینوں کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کی ضروریات کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ مگر وہ آپ کے کنبے کے لیے کافی نہ تھا۔ ادھر منصبِ رسالت کے فرائض اتنے بھاری تھے کہ وہ آپ کے جسم اور دل و دماغ کی ساری طاقتیں اور آپ کے اوقات کا ایک ایک لمحہ سونپتے ڈال رہے تھے اور آپ اپنی معاش کے لیے ذرہ برابر بھی کوئی فکر یا کوشش نہ کر سکتے تھے۔ ان حالات میں جب آپ کی ازواجِ مطہرات خرچ کی تنگی کے باعث آپ کے سکونِ طبع میں خلل انداز ہوتی تھیں تو اس سے آپ کے ذہن پر دُہرا بار پڑ جاتا تھا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ حضرت زینب کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے آپ کی چار بیویاں موجود تھیں۔ حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ۔ ام المومنین حضرت زینب آپ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اس پر مخالفین نے یہ اعتراض اٹھایا، اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس سے شبہات ابھرنے لگے کہ دوسروں کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع ٹھیرا دیا گیا ہے، مگر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پانچویں بیوی کیسے کر لی۔

موضوع اور مباحث | یہ مسائل تھے جو سورۂ احزاب کے نزول کے زمانے میں پیش آئے تھے اور انہی پر اس سورے میں کلام فرمایا گیا ہے۔

اس کے مضامین پر غور کرنے، اور پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری سورۃ ایک خطبہ نہیں ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہو، بلکہ یہ متعدد احکام و فرامین اور خطبات پر مشتمل ہے جو اُس زمانہ کے اہم واقعات کے سلسلے میں یکے بعد دیگرے نازل ہوتے اور پھر یکجا جمع کر کے ایک سورۃ کی شکل میں مرتب کر دیئے گئے۔ اس کے حسبِ ذیل اجزاء صاف طور پر ممیز نظر آتے ہیں:

۱۔ پہلا رکوع غزوۂ احزاب سے کچھ پہلے کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس رکوع کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے وقت حضرت زید حضرت زینب کو طلاق دے چکے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس ضرورت کو محسوس فرما رہے تھے کہ

متبنّٰی کے بارے میں جاہلیت کے تصورات اور اوہام و رسوم کو مٹایا جائے، اور آپ کو یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ منہ بولے رشتوں کے معاملہ میں محض جذباتی بنیادوں پر جس قسم کے نازک اور گہرے تصورات رکھتے ہیں وہ اُس وقت تک ہرگز نہ مٹ سکیں گے جب تک آپ خود آگے بڑھ کر اس رسم کو نہ توڑ دیں لیکن اس کے ساتھ ہی آپ اس بنا پر سخت متردّد تھے اور قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے کہ اگر اس موقع پر آپ نے حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا تو اسلام کے خلاف ہنگامہ اٹھانے کے لیے منافقین اور یہود اور مشرکین کو، جو پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں، ایک زبردست شوشہ ہاتھ آجائے گا۔ اس موقع پر رکوعِ اوّل کی آیات نازل ہوئیں۔

۲۔ رکوع دوم و سوم میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ پر تبصرہ فرمایا گیا ہے۔ یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ یہ دونوں رکوع ان لڑائیوں کے بعد نازل ہوئے ہیں۔

۳۔ چوتھے رکوع کے آغاز سے آیت ۳۵ تک کی تقریر دو مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو، جو اس تنگی و عسرت کے زمانے میں بے صبر ہو رہی تھیں، اللہ تعالیٰ نے نوٹس دیا ہے کہ دنیا اور اس کی زینت، اور خدا و رسول اور آخرت میں سے کسی ایک کو انتخاب کر لو۔ اگر تمہیں پہلی چیز مطلوب ہے تو صاف کہہ دو، تمہیں ایک دن کے لیے بھی اِس تنگی میں مبتلا نہ رکھا جائے گا بلکہ بخوشی رخصت کر دیا جائے گا۔ اور اگر دوسری چیز پسند ہے تو صبر کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کا ساتھ دو۔ دوسرے حصے میں اُس معاشرتی اصلاح کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا جس کی ضرورت اسلام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ذہن اب خود محسوس کرنے لگے تھے۔ اس سلسلہ میں اصلاح کی ابتدا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے کرتے ہوئے ازواجِ مطہرات کو حکم دیا گیا کہ تبرّجِ جاہلیت سے پرہیز کریں، وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور غیر مردوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں سخت احتیاط ملحوظ رکھیں۔ یہ پردے کے احکام کا آغاز تھا۔

۴۔ آیت ۳۶ سے ۴۸ تک کا مضمون حضرت زینبؓ کے ساتھ حضورؐ کے نکاح کے سلسلے میں ہے۔ اس میں ان تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو مخالفین کی طرف سے اس نکاح پر کیے جا رہے تھے، اُن

تمام شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ حضورؐ کا مرتبہ و مقام کیا ہے، اور خود حضورؐ کو کفار و منافقین کے جھوٹے پروپیگنڈے پر صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

۵- آیت ۴۹ میں طلاق کے قانون کی ایک دفعہ بیان ہوئی ہے۔ یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالباً انہی واقعات کے سلسلے میں کسی موقع پر نازل ہوئی تھی۔

۶- آیت ۵۰-۵۲ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کا خاص ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ حضورؐ ان متعدد پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں جو ازدواجی زندگی کے معاملہ میں عام مسلمانوں پر عائد کی گئی ہیں۔

۷- آیت ۵۳-۵۵ میں معاشرتی اصلاح کا دوسرا قدم اٹھایا گیا۔ یہ حسب ذیل احکام پر مشتمل ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں غیر مردوں کی آمد و رفت پر پابندی۔ ملاقات اور دعوت کا ضابطہ۔ ازواج مطہرات کے بارے میں یہ قانون کہ گھروں میں صرف ان کے قریبی رشتہ دار آ سکتے ہیں، باقی رہے غیر مرد، تو انہیں اگر بات کرنی ہو یا کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے کہیں اور مانگیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے بارے میں یہ حکم کہ وہ مسلمانوں کے لیے ماں کی طرح حرام ہیں اور حضورؐ کے بعد بھی ان میں سے کسی کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

۸- آیت ۵۶-۵۷ میں اُن چہ میگوئیوں پر سخت تنبیہ کی گئی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح اور آپ کی خانگی زندگی پر کی جا رہی تھیں اور اہلِ ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ دشمنوں کی اس عیب چینی سے اپنے دامن بچائیں اور اپنے نبی پر درود بھیجیں۔ نیز یہ تلقین بھی کی گئی ہے کہ نبی تو درکنار، اہلِ ایمان کو تو عام مسلمانوں پر بھی تہمتیں لگانے اور الزامات عائد کرنے سے کلی اجتناب کرنا چاہیے۔

۹- آیت ۵۹ میں معاشرتی اصلاح کا تیسرا قدم اٹھایا گیا ہے۔ اس میں تمام مسلمان عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ جب گھروں سے باہر نکلیں تو چادروں سے اپنے آپ کو ڈھانک کر اور گھونگھٹ ڈال کر نکلیں۔

اس کے بعد آخر سورۃ تک افواہ بازی کی اُس مہم (WHISPERING CAMPAIGN) پر سخت زجر و توبیخ کی گئی ہے جو منافقین اور سفہاء و اراذل نے اس وقت برپا کر رکھی تھی۔

کمرشل انٹرسٹ اور اسلام

از

(صاحبزادہ محمد امیر حمزہ شامی صاحب)

ربٰو کی حرمت کے متعلق قرآن و سنت کے احکام اس قدر واضح، موکد اور اشتباہ و ابہام سے بالا ہیں کہ اس کی ہر صورت کے حرام ہونے پر تیرہ صدی تک علمائے امت میں کامل اتفاق رہا ہے۔ لیکن گذشتہ تقریبًا ایک سو سال کے عرصے میں بعض حضرات نے از سرِ نو اس مسئلے کو معرضِ بحث میں لانے کی کوشش کی ہے۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ تجارتی سود دراصل ربٰو کی تعریف ہی میں نہیں آتا۔ اس لیے اس کی حلت یا حرمت کے مسئلے کو طے شدہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ زمانے کے حالات کے پیشِ نظر اس مسئلے پر اجتہاد کیا جائے اور عصرِ حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ بنکنگ اور تجارت کے سود کی حلت کا حکم لگایا جائے۔ اس لیے اب اس مسئلے نے یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ ربٰو کی صحیح تعریف اور اس کے اطلاق کی ٹھیک ٹھیک حدود بجائے خود زیرِ بحث آگئی ہیں۔

سرسید علیہ الرحمہ کے وقت سے جو کچھ اس مسئلے پر لکھا گیا ہے وہ اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ علم حضرات کے سامنے ہے۔ حال ہی میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور نے اس مسئلے کو پھر سے اٹھایا ہے اور اس پر ایک سیمینار منعقد کیا ہے[۱]۔ ایک لحاظ سے ادارے کا یہ اقدام نہایت بروقت ہے۔ یہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ تقسیمِ ملک سے پہلے جو کچھ اس سوال پر لکھا گیا تھا وہ اس پس منظر کے ساتھ لکھا گیا تھا کہ ہم ایک غیر قوم کی غلامی میں تھے اور سیاسی غلبے کے علاوہ حاکم قوم کے تمدن و ثقافت

[۱] ادارہ اپنے رفقاء کی رائے سیمینار کے انعقاد سے پہلے کتابی صورت میں شائع کر چکا ہے جس کے تینوں مقالہ نگار بدقسمتی سے اس امر پر متفق ہیں کہ کمرشل انٹرسٹ کو جائز قرار دیئے بغیر چارہ نہیں۔ ملاحظہ ہو: "کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت" مرتبہ جعفر شاہ صاحب پھلواروی، شائع کردہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

نے بھی ہمارے قلب و دماغ پر استیلا حاصل کر لیا تھا۔ اب جب کہ ہم بفضلِ خدا آزادی حاصل کر چکے ہیں اور حکومت اور عوام دونوں اس فکر میں ہیں کہ اپنے قوانین کی عمارت اسلام کی اساس پر قائم کریں تو اس سے زیادہ اور کیا مناسب ہو سکتا ہے کہ ہم اس مسئلے پر بھی اپنی بازیافتہ آزادی، اپنے مذہب، اپنی گذشتہ روایات اور مستقبل کے لیے اپنی آرزوؤں کے سیاق میں از سرِ نو غور کریں۔

اس مسئلے کی سائنٹفک تحقیق میں علمی و منطقی بحث شروع کرنے سے پہلے ہمارے خیال میں ایک نفسیاتی عامل کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے جو خفیہ طور پر برسرِ کار رہتا ہے۔ اس لیے ہم سب سے پہلے اس نفسیاتی پس منظر کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں جو سود کی موافقت میں لکھنے والے تقریباً سب اہلِ قلم اصحاب میں مشترک ہے۔ جس کسی نے ان حضرات کی تحریریں پڑھی ہیں وہ ذرا سے غور سے محسوس کر لے گا کہ یہ سب حضرات موجودہ صورتِ حالات کے پیشِ نظر ایک گونہ بے بسی کے احساس سے کلیتہً مغلوب ہیں ان سب کے دلوں میں یہ یقین یکساں طور پر جاگزیں ہے کہ موجودہ زمانے میں تجارت کو بنکوں کے وجود سے جو سہولتیں میسر ہیں وہ کمرشل انٹرسٹ کو جائز سمجھے بغیر کسی صورت حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر ان سہولتوں سے ہم دست بردار ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ یہ انفرادی اور قومی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ متمدن زندگی میں انفرادی سہولتوں کا نظام، تجارتی کاروبار اور ملکی معاملات بنک کاری کے بغیر ناممکن ہیں اور بنک کاری کم از کم کمرشل انٹرسٹ کو جائز قرار دیئے بغیر ناممکن ہے۔ یہ خیال مختلف وجوہ سے بالعموم ہمارے دلوں میں ایسی جڑ پکڑ گیا ہے کہ اس نے ایک عُقدۂ نفسی (COMPLEX) کی صورت اختیار کر لی ہے جو ہمارے تحت الشعور میں پوشیدہ رہتا ہے اور وہیں سے ہماری تمام منطق کو متاثر کرتا ہے۔ جب تک ہمارے قلب کی گہرائیوں میں یہ یقین کارفرما ہے۔ ہم سوا اس کے اور کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر ہمیں اسلام بھی عزیز ہے اور ہمیں بطور ایک متمدن قوم زندہ رہنا بھی منظور ہے تو ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اپنے اسلام میں کوئی نہ کوئی راہ ایسی نکالیں کہ کمرشل انٹرسٹ حلال ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہمیں مسئلے کی آزادانہ تحقیق کرنا ہے تو یکسر لازمی ہے کہ ہم اس عُقدۂ نفسی کا سراغ اس

کی آخری کمین گاہ تک لگائیں اور اس سے نجات حاصل کرکے رہیں۔

اگر ہم زمام فکر اس تعصب کے ہاتھوں سے لے کر تحقیق حق کے ہاتھوں میں دینے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارا مدعا یہ نہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح اسلام میں کمرشل انٹرسٹ کے جواز کی صورت نکال لی جائے بلکہ ہم غیر جانبدارانہ اور سائنٹفک سپرٹ میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ حرمت ربوا کے اسلامی احکام کے الفاظ اور ان کی روح بغیر کسی توڑ مروڑ کے کمرشل انٹرسٹ کے جواز کی گنجائش چھوڑتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ احکام حرمت میں کمرشل انٹرسٹ بھی شامل ہے تو ہم بلا کسی چون وچرا یا دل گرفتگی کے اس فیصلے کے پابند ہو جائیں گے اور اس مسئلے کے متبادل اسلامی حل کی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔

اس غلط خیال کے اثر کو کلی طور پر اپنے ذہن سے خارج کرنے کے لیے ہمارے خیال میں کم از کم دو باتوں کا احساس کر لینا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ متمدن زندگی کے لیے جو بات لازمی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ زندگی کے معاملات میں جو ضروریات اور مشکلات پیش آتی ہیں ان کو پورا کرنے اور حل کرنے کی کوئی نہ کوئی قابل عمل اور تسلی بخش صورت نکالی جائے، نہ یہ کہ ان مشکلات کا جو حل غیر اسلامی نظاموں نے پیش کیا ہو اسی کو من وعن اختیار کر لیا جائے خواہ وہ اسلامی احکام کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اصل ضرورت ایک مریض کے مرض کا ازالہ ہے نہ کہ اس کے کسی مخصوص نسخہ کا پابند ہونا خواہ وہ حرام ادویہ پر ہی مشتمل ہو۔ آج اگر ایک مرض کا علاج مثلاً شراب سے کیا جاتا ہے تو ضرورت اس کی ہے کہ جو حلال دوا میسر آسکتی ہے اُسے چھوڑ کر شراب ہی کو حلال قرار دینے پر زور دیا جائے۔ یعنی در اصل اس مرض کا علاج دریافت کرنا متمدن زندگی کے لیے ناگزیر ہے نہ کہ شراب ہی کا جواز ڈھونڈنا۔

دوسرے ہمیں اس بات کا پورے طور پر یقین ہونا چاہیے کہ متبادل حل ممکن بھی ہے اور قابل عمل بھی۔ خوش قسمتی سے موجودہ بنک کاری کی سہولتوں کی متبادل صورت کو ایجاد کرنے کا بار بھی ہم پر نہیں ہے بلکہ متبادل نظام کافی حد تک بڑی حد تک عمل میں آنے کا بھی رہ چکا ہے۔ تمہیں شاید ہی

اس میں بعض اضافوں یا ترمیموں کی ضرورت پیش آئے۔

ماضی کی اسلامی تاریخ پر ایک غائر نظر آپ کو یقین دلا سکتی ہے کہ موجودہ بنک کاری کی تقریباً سبھی سہولتیں آغاز اسلام ہی سے حاصل رہ چکی ہیں۔ ڈیپازٹ کا طریقہ، چیکوں کے ذریعہ سے ادائیگی، ایک شہر سے دوسرے شہروں میں ترسیل زر، ڈرافٹ، ملکی اور تجارتی اغراض کے لیے کثیر رقموں کی فراہمی ان سب کا انتظام موجود تھا۔ جس کی تفصیلات تاریخ میں ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ (آپ کے لیے دلچسپی کا موجب ہوگا اگر میں ذکر کردوں کہ) خود لفظ چیک ایک عربی لفظ "صک" کی مغربی صورت ہے جو عربوں میں ایک قسم کی ہنڈی کے لیے مستعمل تھا۔ یہ طریقہ بھی اور یہ لفظ بھی سپین کی وساطت سے یورپ کے دوسرے ملکوں میں پہنچا اور اب دنیا بھر میں رائج ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کے ایک ایسے ہی "صک" کی عبارت بھی دستیاب ہوئی ہے جس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آج بھی چیک کی عبارت اس سے کچھ مختلف نہیں۔ قصہ مختصر مسلمانوں میں صیرفہ (MONEY CHANGING) جسے آج بینکنگ اور اس کی لوازمات [illegible] [illegible] موجودہ بینکنگ کے ایک ایک وظیفہ (FUNCTIONS) [illegible] اس کی متبادل جائز صورت متعین کی جا سکتی ہے جو کاملۃً قابل عمل ہو۔

اپنے دامنِ خیال کو گردِ تعصب سے اس طرح پاک کر لینے کے بعد ہم ربوٰا کی تعریف متعین کرنے کے لیے غیر جانبدارانہ اور آزادانہ سپرٹ میں قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اس کا صحیح طریقہ تو یہی ہے کہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس صورت میں سوال نامے کا پہلا سوال[1] بظاہر مسئلہ زیر بحث سے بے تعلق نظر آئے گا۔ لیکن بات یہ ہے کہ بعض حضرات نے قرآن و سنت سے قطع نظر کر کے اس بحث میں تاریخ سے مدد لی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ الربوٰا سے مراد ربوٰا کی صرف وہی صورتیں ہو سکتی ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت سامعین قرآن یعنی عربوں میں رائج تھیں۔ اور تجارتی قرضوں کا اس وقت (ان حضرات کے نزدیک) رواج ہی نہیں تھا بلکہ یہ سولہویں صدی عیسوی سے رائج ہوئے ہیں اس لیے ان کے

[1] سوال یہ تھا: عرب میں پیغمبر اسلام صلعم کے زمانہ میں قرضہ لینے دینے کی شکل کیا تھی؟

خیال میں کمرشل انٹرسٹ ربوٰا کی تعریف میں شامل نہیں ہوسکتا۔ اس طرح اس تاریخی بحث اور مسئلہ زیر بحث میں تعلق پیدا ہوجاتا ہے۔ پس پہلے سوال کا جواب دینے کے لیے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مندرجہ بالا استدلال کے دونوں ہی مقدمات غلط ہیں۔ اس لیے لازم تھا کہ غلط نتیجے پر منتج ہوں۔

پہلے مقدمہ اولیٰ پر غور فرمائیے کہ الربوٰا سے وہی صورتیں مراد ہوسکتی ہیں جو نزول قرآن کے وقت عرب میں رائج اور عرب سامعین کے ذہن میں معہود تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معقولیت کا عام اور مسلم اصول ہے کہ لِکُلٍّ اَنْ یَّصْطَلِحَ (یعنی ہر شخص کو حق ہے کہ اپنے اظہار مطالب کے لیے حسب ضرورت اصطلاحات وضع یا مقرر کرے۔ اب ایک قایل بعض اوقات رائج اصطلاحات سے کام لیتا ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ نئی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور کسی مروجہ لفظ کو ایک مخصوص مفہوم میں استعمال کرکے اسے اپنی مخصوص اصطلاح قرار دے لیتا ہے۔ ایسی صورت میں سامعین کے معہود ذہنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اصطلاح کے وضع کرنے والے کے معہود ذہنی کا سوال ہوتا ہے۔ جب ایک واضع قانون اپنی اصطلاح کی تعبیر خود کردے تو پھر اس سیاق میں اس اصطلاح کو کسی اور معنی میں استعمال کرنا غلط ہوجاتا ہے۔ اس کی مثالیں جملہ علوم کی اصطلاحات سے بے شمار دی جاسکتی ہیں لیکن محض قانونی اصطلاحات کا ذکر کردینا ہی کافی ہے۔ بالعموم ہر ایکٹ اپنے متن میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی تعریف ابتدا ہی میں کردیتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوال ہی غیر متعلق اور غیر ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اصطلاح اس قانون کے وضع ہونے سے پہلے بھی اس مفہوم میں مستعمل تھی یا نہیں۔ سامعین کے معہود ذہنی کی تفتیش کی ضرورت تو اس وقت ہوسکتی ہے جب واضع قانون نے اپنی اصطلاح کا مفہوم خود واضح نہ کردیا ہو۔ الربوٰا کے متعلق خود قرآن پاک کی عبارت سے صراحتًا معلوم ہوجاتا ہے کہ اسے کس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اس کے علاوہ قرآن کے مخاطب اول جناب رسول مقبول صلعم نے بالصراحت و بالتفصیل بتادیا کہ ربوٰا کے اصطلاحی معنی مراد خداوندی کے مطابق کیا ہیں اس کے بعد یہ سوال زائد از ضرورت اور خارج از بحث ہوجاتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت عربوں میں ربوٰا کی کیا کیا صورتیں رائج تھیں اور ربوٰا سے متعلق ان کا معہود ذہنی کیا تھا۔ اس سوال کی تفتیش کا نتیجہ کچھ بھی ہو اس کا احکام قرآنی کی نوعیت پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔

یہاں تک تو پہلے مقدمہ سے بحث تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں اس استدلال کا دوسرا

مقدمہ بھی سر تا سر غلط ہے کہ عربوں میں نزول قرآن کے وقت تجارتی قرضوں کا رواج ہی نہ تھا۔ یہ "تاریخی" دعویٰ بھی تاریخی حقائق سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں میں یہ رواج نزول قرآن کے وقت بھی تھا۔ اور بعد میں بھی برابر رہا۔ اس لیے اگر عربوں کے معہود ذہنی کو دیکھنا درست بھی ہو تب بھی تجارتی قرضوں کا سود ربوٰا کی تعریف سے باہر نہیں رہتا۔ تجارتی قرضے کے سود کو ربوٰا میں شامل نہیں سمجھنا چاہیئے تو بار ثبوت اس مدعی پر آپڑتا ہے کہ وہ دکھائے کہ باوجود تجارتی قرضوں کے رواج کے ان پر سود لینا جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین یا فقہائے اسلام علیہم الرحمۃ نے جائز قرار دیا اور اسے وہ ربوٰا کی تعریف میں داخل نہ جانتے تھے۔ بہر حال پہلے دن کی مجلس میں جب یہ دعویٰ سامنے آیا تو ہم نے تاریخی حیثیت سے اس کے غلط ہونے پر اصرار کیا۔ چنانچہ دسویں صدی سے پہلے اور خصوصاً نزول قرآن کے وقت عربوں میں تجارتی قرضوں کے رواج کا تاریخی ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری ہم پر ڈالی گئی۔

ایسے قرائن و شواہد کا تو شمار ہی نہیں جن سے ایک غیر جانبدار ذہن سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ عربوں میں نزول قرآن کیا اس سے بھی پہلے سے تجارتی قرضوں کا رواج موجود تھا لیکن گفتگو کی فضا سے ہمیں محسوس ہوا کہ قرائن شاید تسلی بخش ثابت نہ ہوں۔ ضرورت ایسی واضح اور معین مثالوں کی ہے جن کے بارے میں اصل ماخذ میں تصریح موجود ہو کہ قرضہ تجارتی اغراض کے لیے لیا یا دیا گیا۔ بعض مثالیں ذہن میں تھیں لیکن لفظی صراحت والی مثالوں کے لیے مآخذ کو کھنگالنے کی ضرورت تھی۔ خوش قسمتی سے ہمیں فضل الرحمٰن صاحب کا کمرشل انٹرسٹ کے موضوع پر ایک مقالہ (مطبوعہ اسلامک تھاٹ (ISLAMIC THOUGHT) علیگڑھ) دستیاب ہوا جس نے نہ صرف مثالوں کے انتخاب کے لیے اصل ماخذ کی طرف رجوع کی دقت سے ہمیں بچا لیا بلکہ ہند بنت عتبہ اور قاضی ابو یوسف رحؒ کی دو بالکل نئی مثالیں بھی ہم کو دیں۔ اس سے بھی بڑھ کر متعلقہ اقتباسات دحوالہ جات بھی چھٹے چھٹائے ہمیں اس مقالے میں مل گئے۔ مندرجہ بالا سب مثالوں کے لیے ہم فضل الرحمٰن صاحب کے مقالے کے ممنون ہیں۔ صرف آخری مثال ڈاکٹر امام الدین صاحب کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے جو

اسلامک کلچر میں شائع ہوا تھا۔

ہم نے کہیں کہیں اپنے الگ حوالے بھی ذکر کیے ہیں لیکن اس سے مذکورہ مقالے سے ہمارے اخذ و اکتساب اور ہماری ممنونیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

ایک لحاظ سے تو صرف مذکورہ بالا مضمون کا حوالہ دے دینا کافی ہوتا۔ لیکن ایک تو ہم یہاں بات کو تشنہ نہیں چھوڑنا چاہتے دوسرے ہم بعض مثالوں کے مضمرات کا اپنے نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنا چاہتے ہیں لہٰذا مختصراً مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔

تاریخی ترتیب سے سب سے پہلی مثال حضرت زبیر بن العوام کی ہمارے سامنے آتی ہے یہ مثال کئی حیثیت سے نہایت اہم ہے۔ ایک تو یہ خود آنحضرت صلعم کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے دوسرے حضرت زبیر ابن العوام کوئی غیر معروف شخصیت نہیں بلکہ محترم ترین صحابہ میں سے تھے۔ ایمان لانے میں چوتھے یا پانچویں نمبر پہ تھے۔ بڑے پائے کے تاجر تھے اور امانت و دیانت میں بہ شہرت رکھتے تھے۔ [illegible] اپنے اموال ان کے پاس حفاظت [illegible] [illegible] تجارتی قرضہ لینے یا دینے کی نہیں ہے بلکہ ان کے طریق کار کا بہ غور جائزہ لیا جائے تو ان کا طریقہ بالکل وہی طریقہ تھا جسے بینکرز کا طریقہ کہنا چاہیے۔ اس طریقہ کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے بینکنگ کی اساس کا سرسری سا مطالعہ کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

تجارت کے لیے قرضہ حاصل کرنے کی ہمیشہ انفرادی اور سادہ، واضح صورت ہی نہیں اختیار کی جاتی بلکہ ایک دوسری صورت قدرے زیادہ پیچیدہ اور غیر واضح بھی ہے جس پر بنکنگ کی عمارت قائم ہے بنک جانتے ہیں کہ بہت سے حضرات اپنے اموال بجائے اپنے پاس رکھنے کے ایسے اشخاص یا اداروں کے پاس رکھوانا زیادہ پسند کریں گے جن کے پاس حفاظت کے بہتر انتظامات موجود ہوں اور انہیں صرف یہ مطلوب ہے کہ جب اور جتنا جتنا روپیہ اپنی رقم میں سے چاہیں انہیں بلا چون و چرا کے مل جایا کرے۔ انہیں اس سے بحث نہیں کہ بنک ان کی رقم کو کس حیثیت میں اپنے پاس رکھتا ہے۔ لیکن

بنک اس قانونی باریکی کو دیکھتا ہے کہ اگر وہ لوگوں کا روپیہ ودیعت کے طور پر رکھے تو اسے بیکار رکھے رہنا پڑے گا۔ حالانکہ اگر وہ اسی روپے کو انہیں شرائط کے پورا کرنے کے وعدہ پر بطور قرض اپنے پاس رکھے تو وہ اس دوران میں جمع کرنے والوں کے روپے کے ایک کثیر حصے کو اپنی منشاء کے مطابق اپنی تجارت یا سودی کاروبار میں لگانے کا مجاز ہوتا۔ اور جمع کرانے والوں کو بھی اس میں یہ فائدہ ہوگا کہ ان کا روپیہ بنک کے ذمے قرضے کے طور پر مضمون ہو جائے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ بنک میں روپیہ رکھنے والوں کی اکثریت اس نکتے سے واقف ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ بنک میں رکھا ہوا روپیہ بنک بطور قرض لیتا ہے اور آگے اسے اپنی تجارت یا کاروبار میں لگا دیتا ہے۔ چنانچہ بنہم (BENHEN) رقم طراز ہے:

"بنک میں رکھے ہوئے ڈیپازٹ کی مثال ایسی نہیں جیسے کوئی کلوک روم میں اپنا سامان بطور امانت رکھوا دے بلکہ یہ دراصل بنک کو دیے ہوئے قرضے ہوتے ہیں۔ جن کے متعلق بالعموم سب جانتے ہیں کہ بنک اس روپے کے کثیر حصے کو آگے قرض پر چلا دے گا۔" (BENHEN ECNOMIC P.363)

بالکل اسی اصول پر جمع کیے ہوئے تجارتی قرضے کی مثالیں تاریخ اسلام میں شروع ہی سے ملتی ہیں یا یوں کہئے کہ آغاز اسلام ہی سے ہمیں بینکرز انفرادی حیثیت سے لیکن بڑے اونچے پیمانے پر باقاعدہ مصروف بینک کاری نظر آتے ہیں۔ جن میں ایک مثال حضرت زبیر ابن العوامؓ کی ہے۔ حضرت زبیر کے پاس لوگوں کی رقمیں آتی رہتی تھیں اور لوگ اپنی رقموں کا جز یا کل وقتاً فوقتاً واپس بھی لیتے رہتے تھے۔ اس طرح اگر کسی وقت بھی حضرت زبیرؓ کو حفاظت کے لیے دی ہوئی رقموں کی میزان لگائی جاتی تو وہ ایک خطیر رقم تھی۔ یہ درحقیقت اس وقت ان کے ذمے قرضے کا کل ہوتا تھا جس سے وہ بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔ ان کے طریق کار کے متعلق ساری تفصیلات ہمیں اصل ماخذ میں بصراحت ملتی ہیں اور تجارت قیاسات پر مبنی نہیں ہیں۔

(۱) یہ کہ جب کوئی شخص حضرت زبیر ابن العوام کے پاس اپنا مال ودیعت کے طور پر رکھنے آتا تھا تو وہ اس رقم کو بطور ودیعت [illegible] اپنے ذمے قرض [illegible] منظور کرتے تھے [illegible]

ابن سعد میں صراحت ہے۔

"انما کان دَینُہٗ الذی کان علیہ اَنَّ الرجل کان یاتیہ بالمال یستودعہ اِیّاہٗ فیقول الزبیر لا ولکن ھو سلف ۔ انی اخشیٰ علیہ الضیعۃ"

فضل الرحمٰن صاحب نے یہی عبارت بخاری کے حوالے سے دی ہے اور فتح الباری سے اس کی تشریح میں مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے جس سے یہ تفصیل مل جاتی ہے کہ حضرت زبیر ایسا کیوں کرتے تھے:۔

ای ما کان یقبض مِن احدٍ وَدیعۃً اِلَّا ان رَضِیَ صاحِبُھا ان یَجْعَلَھا فِی ذِمَّتِہٖ وَکان غرضہٗ بذالک انہٗ کان یَخْشیٰ علی المال ان یضیع فیظن بہ التقصیر فی حفظہٖ ۔ فرای ان یجعلہٗ مضموناً فیکون اوثق لصاحب المال وابقی لمروتہٖ ۔ وزاد ابن بطال "ولیطیب لہٗ ربح ذالک المال"

یعنی حضرت زبیر کسی کی ودیعت اس وقت تک نہیں لیتے تھے جب تک وہ اس رقم کو ان کے ذمے قرض قرار دینے پر راضی نہ ہو جائے اور اس سے ان کی غرض یہ ہوتی تھی کہ انہیں یہ ڈر رہے کہ مال ضائع ہو جائے اور ان پر حفاظت میں کوتاہی کا گمان کیا جائے۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح اسے مضمون ومحفوظ کردیں کیونکہ یہ صاحب مال کے لیے بھی بہتر ہوگا اور خود اُن کی مروت (اور ساکھ) کے لیے بھی زیادہ باعث پائیداری"۔ اور ابن بطال نے اس پر یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ "وہ ایسا اس لیے بھی کرتے تھے کہ اس مال سے تجارت کرنا اور فائدہ کمانا ان کے لیے جائز ہو جائے"۔

(۳) حضرت زبیرؓ اس طریقے سے کتنی بڑی بڑی رقمیں بطور قرض اپنے پاس ڈیپازٹ کرتے تھے اس کا اندازہ بھی طبقات ابن سعد میں دی ہوئی رقموں سے ہوتا ہے۔ ان کے انتقال کے وقت حساب کیا گیا تو ان کے ذمے ۲۲،۰۰،۰۰۰ کی رقم قرض تھی۔

"وقال عبد اللہ ابن الزبیر فحسبتُ ما علیہ من الدین فوجدتہٗ الفی الف ومائتی الف"

یعنی "عبد اللہ ابن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے حساب کیا کہ ان پر (حضرت زبیرؓ) کتنا قرض ہے تو یہ رقم بائیس لاکھ نکلی"۔

(۴) یہ تمام سرمایہ تجارت میں لگا ہوا تھا۔ کیونکہ انتقال سے پہلے حضرت زبیر نے اپنے فرزند عبداللہ ابن زبیر کو ہدایت کی کہ ہماری املاک کو فروخت کر کے یہ تمام قرض ادا کیا جائے اور یہ انہی رقموں کی میزان تھی جو لوگ ان کے پاس بطور ودایع کے لاتے تھے لیکن وہ بطور قرض برائے تجارت قبول کرتے تھے۔ ابن سعد نے یوم جمل کی ساری گفتگو مابین حضرت زبیر و عبداللہ ابن زبیر روی ہے جس سے ساری بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ ہم طوالت کے خوف سے اصل عبارت نقل نہیں کرتے۔ تجارت کے لیے نیک کارانہ طریقے پر فراہم کیے ہوئے قرضوں کی یہ واحد مثال نہیں ہے بلکہ یہ طریقہ بعد میں بھی قائم رہا اور تاریخ میں اس کی مثالیں بالوضاحت ملتی ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی مثال آگے آتی ہے۔ فی الحال ہم زمانی ترتیب کے لحاظ سے حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۲) طبری نے ۲۳ھ کے واقعات میں ہند بنت عُتبہ کا واقعہ لکھا ہے کہ:

ان هند بنت عتبة قامت الى عمر بن الخطاب فاستقرضته من بيت المال اربعة الاف تتجر فيها وتضمنها فاقرضها فخرجت الى بلاد كلب فاشترت و باعت فلما اتت المدينة و باعت شكت الضيعة فقال لها عمرؓ لو كان مالى لتركته، ولكنه مال المسلمين۔

ترجمہ: ہند بنت عتبہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آئی اور مناسب ضمانت پر بیت المال سے چار ہزار کی رقم قرض مانگی تاکہ وہ اس سے تجارت کر سکے۔ چنانچہ اسے یہ قرض دیا گیا اور وہ بلاد کلب میں گئی اور مال خریدا اور بیچا اور جب مدینے میں آئی اور مال بیچا تو شکایت کی کہ اسے نقصان ہوا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر یہ میرا روپیہ ہوتا تو میں چھوڑ دیتا لیکن یہ تو مسلمانوں کا مال ہے۔"

(تاریخ طبری بحوالہ فضل الرحمٰن صاحب)

خاص طور پر نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ تصریح اصل عربی عبارت میں صراحتًا موجود

ہے کہ قرض تجارت کے لیے مانگا اور دیا گیا اور واقعتہً ہند بنت عتبہ نے اس رقم سے تجارت ہی کی

(۳) تیسری مثال بھی حضرت عمرؓ کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے اور بیت المال ہی سے تجارت کے لیے روپیہ قرض دینے کا واقعہ ہے۔

مؤطا امام مالکؒ میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادگان حضرت عبداللہ اور حضرت عبیداللہ ایک لشکر کے ساتھ عراق گئے۔ لوٹتے وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری سے ملنے گئے تو انہوں نے خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگر میرے امکان میں کوئی ایسی بات ہو کہ آپ کو نفع پہنچا سکوں تو ضرور کروں گا۔ پھر خود ہی کہا ہاں کیوں نہیں میرے پاس بیت المال کی ایک رقم ہے جو میں امیرالمومنین کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں وہ میں آپ کو قرض دے دیتا ہوں۔ آپ اس سے تجارت کا مال عراق سے خریدیں اور اس کو جا کر بیچیں اور اصل رقم امیرالمومنین کو پہنچا دیں اور منافع خود رکھ لیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور حضرت عمرؓ کو اطلاع دے دی گئی کہ اتنی رقم ان سے لے لیں۔ پس جب وہ آئے اور سامان بیچا اور نفع کمایا اور اصل رقم حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کی تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تمہاری طرح لشکر کے دوسرے لوگوں کو بھی قرض دیا گیا؟ ہر دو صاحبزادگان نے کہا کہ نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "ہاں تم دونوں امیرالمومنین کے بیٹے ہو نا اس لیے تمہیں قرض دیا گیا پس اصل رقم اور اس سے جو نفع کمایا ہے دونوں داخل کرو۔ حضرت عبداللہ خاموش رہے مگر حضرت عبیداللہ نے کہا امیرالمومنین آپ کو ایسا نہیں چاہیے۔ کیا اگر یہ رقم ضائع ہو جاتی یا نقصان ہو جاتا تو پوری رقم ہم سے نہ وصول کر لی جاتی اور ہم اس کے ضامن نہیں تھے؟ حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ بس ادا کرو۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ امیرالمومنین اس معاملے کو قراض (مضاربت) ہی تصور کر لیجیے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا قراض مانے لیتے ہیں اور اصل کے علاوہ منافع کا بھی نصف وصول کر لیا اور منافع کا باقی نصف حضرت عبداللہ اور حضرت عبیداللہ نے لے لیا۔

مندرجۂ بالا واقعہ سے ظاہر ہے کہ روپیہ اصل میں بطور تجارتی قرض ہی کے دیا گیا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے مصلحتاً اسے قراض قرار دیا۔

یہاں یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ بعض صورتوں میں تجارت کے لیے روپیہ قرض لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دینے والا دے تو دیتا ہے مگر محض قرض کے طور پر نہیں دینا چاہتا اور معاملہ منافعِ تجارت میں حصّہ داری پر طے پاتا ہے۔ شاید اس مخصوص شکل کو ظاہر کرنے کے لیے قراض کی اصطلاح وضع کی گئی جو مضاربت کے ہم معنی مستعمل ہے لیکن آپ یہ فرقِ واقعات ملحوظ رکھیں کہ ضرورت قرض کی پیش آئی لیکن معاملہ مضاربت پر طے پایا۔ یہ صورتِ واقعات اُن حالات سے یقیناً مختلف ہے کہ ایک صاحبِ مال دوسرے تاجر (جو ضروری نہیں کہ حاجتمند ہو) کے ساتھ منافع کی حصے داری کی اساس پر تجارت میں شریک ہو۔ چنانچہ مندرجۂ بالا واقعہ امام مالک نے باب القراض ہی میں ذکر کیا ہے[1]۔

---

[1] معلوم ہوا کہ سیمینار کے انعقاد کے بعد بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "مؤطا امام مالکؒ کا حوالہ ہم نے غلط دیا ہے کیونکہ مؤطا میں ایسا کوئی واقعہ مذکور نہیں"۔ ہمیں اس قول پر حیرت ہے۔ بہر حال یہ تصریح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پیشِ نظر مؤطا کا وہ ایڈیشن تھا جو کتب خانہ رحیمیہ دہلی کا شائع کردہ ہے اور جس میں مؤطا مع ہر دو شرح یعنی مصفّٰی و مسوّٰی مصنفہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ چھپی ہے۔ اس نسخے میں روایت کا ایک ٹکڑا متن میں دیا گیا ہے اور پورا واقعہ نوٹ میں دیا گیا ہے۔ مبادا کسی کو غلط فہمی ہو کہ نوٹ شاہ ولی اللہ صاحب کا ہے اور اس طرح تمام روایت کا انتساب مؤطا سے غلط ہے تو یہ گزارش ہے کہ اس سارے واقعے کو ائمۂ علم ہمیشہ مؤطا ہی سے منسوب کرتے رہے ہیں اور راقم الحروف اس حوالے میں اکیلا نہیں مثلاً امام زیلعی نصب الرایہ میں فرماتے ہیں (جلد چہارم۔ کتاب المضاربت):۔

قولہ وروی ان الصحابۃ تعاملوا بھا۔ قلت روی مالک فی الموطا عن زید بن اسلم عن ابیہ ان عبد اللہ وعبید اللہ ابنی عمر بن الخطاب خرجا الی العراق فاعطھما ابو موسیٰ

(۴) اسی طرح حضرت عثمان کے یعقوب کو قراض پر روپیہ دینے کا ذکر ملتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا تذکرہ جو ہماری نظر سے گزرا موطا امام مالکؒ میں ہے۔ پھر ابن سعد نے بھی طبقات میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن فضل الرحمٰن نے اپنے مضمون میں بیہقی کے حوالے سے زیادہ تفصیل دی ہے۔ ہم وہیں سے نقل کرتے ہیں۔

علاء ابن عبدالرحمٰن بن یعقوب سے روایت ہے کہ ان کے دادا حضرت عثمان کے پاس گئے اور کہا کہ اس کا مال تجارت آگیا ہے اور اسے روپے کی ضرورت ہے اور استدعا کی کہ اسے قرض دے دیں تاکہ وہ مال خرید کر بیچے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ اگر واقعتہً ضروری ہے تو میں رقم دے دیتا ہوں لیکن یعقوب کے مکاتب ہونے کے باعث اس نے استدعا کی کہ معاملہ منافع میں نصف نصف شرکت کی صورت میں کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس پر اتفاق کر کے رقم دے دی۔

یہاں بھی معاملہ کی وہی نوعیت ہے کہ قرض کی ضرورت سے شروع ہوا اور مضاربت کی صورت میں طے کیا گیا۔ بیہقی نے بھی اسے کتاب القراض ہی میں نقل کیا ہے۔

(۵) اس کے بعد ہم حضرت امام ابوحنیفہ کی مثال پر آتے ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تجارت جس پیمانے پر چلتی تھی اس کی تفصیلات تاریخ میں موجود ہیں۔ دوسری طرف ان کے پاس بطور ودیعت کے کتنا مال آتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف تیل کے ایک تاجر نے آپ کے پاس ایک لاکھ ستر ہزار درہم رکھوائے تھے۔ (مناقب النعمان)

مناقب النعمان کی مندرجۂ ذیل عبارت اور ملاحظہ ہو: قال سفیان ابن وکیع بن

۴- من مال اللّٰہ علی ان بیناعا بہ متاعًا و یبیعانہ بالمدینۃ و یؤدّیا راس المال لامیر المومنین والربح لہما فلما قدما المدینۃ ربحا فقال عمرؓ أکل الجیش اسلفہ کما اسلفکما؟ قالا لا فقال ابنا امیر المؤمنین فاسلفکما ادیا المال و ربحہ فراجعہ عبید اللّٰہ وقال ما ینبغی ھذا یا امیر المومنین لو ھلک المال اونقص لضمناہ فقال لہ بعض جلسائہ لو جعلتہ قراضًا فاخذ عمر المال و نصف ربحہ و اعطٰہما النصف۔

الجراح قال ابی کان ابوحنیفة عظیم الامانة ومات ابوحنیفة وفی بیته خمسون الف الف" یعنی سفیان ابن وکیع ابن الجراح نے کہا میرے والد بتاتے ہیں کہ ابوحنیفہ عظیم الامانت تھے اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے گھر میں ۵ کروڑ کی رقم تھی۔

(۶) قاضی امام ابویوسفؒ کی مثال بھی بالکل واضح ہے۔ فقہ اسلامی نے یتامیٰ کے اموال کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ گنجائش رکھی ہے کہ قاضی یتامیٰ کے مال کو قرض دے دے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے:

ویقرض القاضی اموال الیتامیٰ	قاضی کو چاہیے کہ یتامیٰ کے اموال کو قرض دے دے۔

اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

لان فی الاقراض مصلحتهم لبقاء الاموال محفوظة مضمونة۔	یہ اس لیے کہ ان کے مال کو قرض پر دے کر محفوظ و مضمون کر دینے میں ان کے مال کی بقا کے لیے مصلحت ہے۔

پھر یہ تصریح بھی موجود ہے کہ اگر قرض مانگنے والا ابتدا ہی میں نادار و مفلس ہو تو اسے مال یتامیٰ قرض پر نہ دیا جائے:-

ولوکان المستقرض معسراً فی الابتداء لا یجوزان یقرضہ مال الیتیم۔

قاضی ابویوسف کے متعلق ان کے حالات میں ذکر ملتا ہے کہ وہ یتامیٰ کے اموال جو بحیثیت قاضی ان کی تحویل میں رہتے تھے مضاربت پر دے دیتے تھے اور اس کا منافع اپنے لیے رکھ لیتے تھے۔ خطیب بغدادی نے ان کے حال میں یہ فقرہ معترضانہ انداز میں لکھا ہے کہ: انه کان یعطی اموال الیتامیٰ مضاربة ویجعل الربح لنفسه۔ لیکن جو فقہ کے مندرجہ بالا مسئلہ کو سمجھتا ہے وہ حقیقت حال کو فوراً سمجھ لیگا کہ اس میں امام ابویوسف کسی قابل اعتراض بات کے مرتکب نہیں تھے۔ وہ یتامیٰ کے مال کو خزانۂ قضا سے اپنی ذاتی حیثیت سے قرض لے لیتے تھے اور اس کو آگے مضاربت پر تجارت میں لگا دیتے تھے جس کا نفع وہ

خود لینے کے اخلاقاً و قانوناً حقدار تھے۔ یہ بھی تجارتی قرض کی واضح مثال ہے۔

(۷) اسی طرح ڈاکٹر امام دین نے اپنے ایک مضمون میں رائی بیرا RIBERA کے حوالہ سے تیسری صدی ہجری کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ قاضی سلیمان بن اسود نے حبیب احمد محمد بن زیاد اللخمی کو پانچ ہزار دینار تجارت میں لگانے کے لیے قرض دیئے (مضمون ڈاکٹر امام الدین صاحب مطبوعہ اسلامک کلچر جنوری ۱۹۶۰ء)

پہلے سوال کا فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں امید ہے یہ مثالیں کافی ہونگی اور اس میں شک نہ رہ گیا ہوگا کہ دسویں صدی سے بہت پہلے آغاز اسلام ہی سے عربوں میں تجارتی قرضے رائج تھے اس لیے تجارتی قرضوں کے سود کو کسی صورت بھی الربوٰ کی تعریف سے باہر نہیں رکھا جا سکتا۔ جو لوگ یورپ کے کسی مصنف کے اس دعوے پر یقین کر بیٹھے ہیں کہ دسویں صدی سے پہلے تجارتی قرضوں کا کہیں رواج نہ تھا وہ ایک بے سر و پا دعوے پر بلا تنقید ایمان لے آئے ہیں محض اس لیے کہ وہ ایک یورپی مصنف کا قول ہے۔

(باقی)

رسائل و مسائل

(مندرجہ ذیل سوالات لا کالج کے ایک فارغ التحصیل نوجوان نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں ارسال کیے تھے۔ مولانا نے اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں ان کے جوابات تحریر فرمائے ہیں۔ یہ سوالات کسی ایک فرد کی ذہنی الجھن کی غمازی نہیں کرتے بلکہ ان کے اندر ایک انسان اُن شکوک و شبہات کی پوری جھلک دیکھ سکتا ہے جو امتِ مسلمہ کی نوخیز نسلوں کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک فرد کے خیالات نہیں بلکہ پوری نسل کے احساسات ہیں۔ ان کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم انہیں قارئین ترجمان القرآن کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔) (ع۔ ح۔ ص)

دَورِ جدید کی رہنما قوت ــــ اسلام یا عیسائیت؟

سوال۔ "بیسویں صدی کے اس مہذب و ترقی یافتہ دَور کی رہنمائی بھی مذہبی نقطۂ نظر سے اسلام کر سکتا ہے یا عیسائیت؟ کیا انسان کو سیکولرزم یا دہریت جسمانی و مادی ترقی کی معراج نصیب کرا سکتی ہے؟ بالخصوص کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے اور ختم کرنے کی صلاحیت کس میں ہے"؟

جواب ۔ یہ سوال کئی سوالات کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس کے ایک ایک جزو پر علیحدہ بحث کرنی ہوگی۔

(الف) جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے اس دَور کی رہنمائی سے وہ پہلے ہی دستبردار ہو چکی ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ کسی دَور میں بھی انسانی تہذیب و تمدن کی رہنمائی نہیں کر سکی ہے۔

عیسائیت سے مراد اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وہ تعلیمات ہیں جو اب عیسائیوں کے پاس ہیں تو بائیبل کے عہد جدید کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ وہ انسانی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا رہنمائی اور کتنی رہنمائی کرتی ہے؟ اس میں بجز چند مجرد (ABSTRACT) اخلاقی اصولوں کے اور سرے سے کوئی چیز موجود نہیں جس سے انسان اپنی معاشرت اور اپنی معیشت اور سیاست اور عدالت اور قانون کے متعلق کوئی ہدایت حاصل کر سکے۔ لیکن اگر عیسائیت سے مراد وہ نظامِ زندگی ہے جو عیسائی پادریوں نے بنایا تھا تو سب کو معلوم ہے کہ یورپ میں احیائے علوم کی نئی تحریک کے رونما ہونے کے بعد وہ ناکام ہو گیا اور مغربی قوموں نے اس کے بعد جتنی کچھ بھی مادی ترقی کی وہ عیسائیت کی رہنمائی سے آزاد ہو کر ہی کی ہے۔ اگرچہ اسلام کے خلاف عیسائیت کا تعصب اور عیسائیت کے ساتھ ایک جذباتی تعلق اُن میں اس کے بعد بھی موجود رہا اور اب بھی ہے۔

(ب) جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اپنے آغاز ہی سے تمدن و تہذیب کے معاملے میں نہ صرف یہ کہ رہنمائی کرتا رہا ہے بلکہ اس نے خود اپنا ایک مستقل تمدن اور اپنی ایک خاص تہذیب پیدا کی ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق قرآن مجید نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو ہدایت نہ دی ہو اور ان ہدایات کے مطابق عملی ادارے قائم نہ کر دیئے ہوں۔ یہ چیزیں جس طرح ساتویں صدی عیسوی میں قابلِ عمل تھیں اسی طرح اس بیسویں صدی میں بھی قابلِ عمل ہیں اور ہزاروں برس آئندہ بھی انشاء اللہ قابلِ عمل رہیں گی۔ اس "ترقی یافتہ دور" میں کسی ایسی چیز کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی جس کی وجہ سے اسلام آج نہ چل سکتا ہو، یا انسان کی رہنمائی نہ کر سکتا ہو۔ جو شخص اس معاملہ میں اسلام کو ناقص سمجھتا ہو یہ اُس کا کام ہے کہ کسی ایسی چیز کی نشان دہی کرے جس کے معاملے میں اسلام اس کی رہنمائی سے قاصر نظر آتا ہو۔

(ج) سیکولرزم یا دہریت درحقیقت نہ کسی روحانی ترقی میں مددگار ہیں اور نہ مادی

ترقی میں ۔ معراج نصیب کرنے کا ذکر ہی کیا ہے ؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے اہلِ مغرب نے جو ترقی مادی حیثیت سے کی ہے وہ سیکولرزم یا مادہ پرستی یا دہریت کے ذریعہ سے نہیں کی بلکہ اُس کے باوجود کی ہے ۔ مختصراً میری اس رائے کی دلیل یہ ہے کہ انسان کوئی ترقی اس کے بغیر نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بلند مقصد کے لیے اپنی جان و مال، اپنے اوقات اور محنتوں کی اور اپنے ذاتی مفاد کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو لیکن سیکولرزم اور دہریت ایسی کوئی بنیاد فراہم کرنے سے قاصر ہیں جس کی بنا پر انسان یہ قربانی دینے کو تیار ہو سکے ۔ اسی طرح کوئی انسانی ترقی اجتماعی کوشش کے بغیر نہیں ہو سکتی اور اجتماعی کوشش لازماً انسانوں کے درمیان ایسی رفاقت چاہتی ہے جس میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور ایثار ہو ۔ لیکن سیکولرزم اور دہریت میں محبت و ایثار کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے ۔ اب یہ ساری چیزیں مغربی قوموں نے مسیحیت سے بغاوت کرنے کے باوجود ان مسیحی اخلاقیات ہی سے لی ہیں جو ان کی سوسائٹی میں روایتاً باقی رہ گئی تھیں ۔ ان چیزوں کو سیکولرزم یا دہریت کے حساب میں درج کرنا غلط ہے ۔ سیکولرزم اور دہریت نے جو کام کیا ہے وہ یہ کہ مغربی قوموں کو خدا اور آخرت سے بے فکر کر کے خالص مادہ پرستی کا عاشق اور مادی لذائذ و فوائد کا طالب بنا دیا ہے ۔ مگر اِن قوموں نے اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جن اخلاقی اوصاف سے کام لیا وہ ان کو سیکولرزم یا دہریت سے نہیں ملے بلکہ اُس مذہب ہی سے ملے جس سے وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے ۔ اس لیے یہ خیال کرنا سرے سے غلط ہے کہ سیکولرزم یا دہریت ترقی کی موجب ہیں ۔ وہ تو اس کے برعکس انسان کے اندر خود غرضی، ایک دوسرے کے خلاف کشمکش اور جرائم پیشگی کے اوصاف پیدا کرتی ہیں جو انسان کی ترقی میں مددگار نہیں بلکہ مانع ہیں ۔

(د) کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کی صلاحیت کسی ایسے ہی نظامِ زندگی میں ہو سکتی ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کو اُس سے بہتر طریقہ پر حل کر سکے اور اس کے ساتھ انسان کو وہ روحانی اطمینان بھی بہم پہنچا سکے جس کا کمیونزم میں فقدان ہے ۔ ایسا نظام اگر بن سکتا ہے تو صرف اسلام کی بنیاد پر بن سکتا ہے ۔

الخلافت یا الحکومت

سوال۔ اگر بیسویں صدی میں بھی اسلامی نظام قابلِ نفاذ ہے تو موجودہ رجحان و نظریات کی جگہ لینے میں جو مشکلات یا موانع درپیش ہوں گے ان کا بہترین حل ابن خلدون کے ہر دو نظریہ حکومت و ریاست یعنی الخلافت یا الحکومت کس سے ممکن ہے؟

جواب: اس زمانے میں اسلامی نظام کو جو چیز نافذ ہونے سے روک رہی ہے اور جو رجحانات اور نظریات اس کے راستے میں سدِّراہ ہیں ان کا اگر تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں مسلمان ملکوں پر مغربی قوموں کے طویل سیاسی غلبہ نے پیدا کیا ہے۔ مغربی قومیں جب ہمارے ملکوں پر مسلط ہوئیں تو انہوں نے ہمارے قانون کو ہٹا کر اپنا قانون ملک میں رائج کیا۔ ہمارے نظامِ تعلیم کو معطل کر کے اپنا نظامِ تعلیم رائج کیا تمام چھوٹی بڑی ملازمتوں سے اُن سب لوگوں کو برطرف کیا جو ہمارے تعلیمی نظام کی پیداوار تھے اور ہر ملازمت ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دی جو اُن کے قائم کردہ نظامِ تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے تھے۔ معاشی زندگی میں بھی اپنے ادارے اور طور طریقے رائج کیے اور معیشت کا میدان بھی رفتہ رفتہ اُن لوگوں کے لیے مخصوص ہو گیا جنہوں نے مغربی تہذیب و تعلیم کو اختیار کیا تھا۔ اس طریقہ سے انہوں نے ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن اور اس کے اصولوں اور نظریات سے انحراف کرنے والی ایک نسل خود ہمارے اندر پیدا کر دی جو اسلام اور اس کی تاریخ، اس کی تعلیمات اور اس کی روایات ہر چیز سے علمی طور پر بھی بیگانہ ہے اور اپنے رجحانات کے اعتبار سے بھی بیگانہ۔ یہی وہ چیز ہے جو دراصل ہمارے اسلام کی طرف پلٹنے میں مانع ہے اور یہی اس غلط فہمی کا موجب بھی ہے کہ اسلام اس وقت قابلِ عمل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ساری تعلیم اور تربیت غیر اسلامی طریقے پر دی گئی ہو وہ آخر اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں کہ اسلام قابلِ عمل نہیں ہے، کیونکہ نہ تو وہ اسلام کو جانتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار کیے

گئے ہیں جس نظام زندگی کے لیے وہ تیار کیے گئے ہیں اسی کو وہ قابلِ عمل تصور کر سکتے ہیں۔ اب لامحالہ ہمارے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو ہم من حیث القوم کافر ہو جانے پر تیار ہو جائیں اور خواہ مخواہ اسلام کا نام لیکر دنیا کو دھوکا دینا چھوڑ دیں۔ یا پھر خلوص اور ایمانداری کے ساتھ (منافقانہ طریق سے نہیں) اپنے موجودہ نظامِ تعلیم کا جائزہ لیں اور اس کا پورے طریقہ سے تجزیہ کر کے دیکھیں کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہم کو اسلام سے منحرف بنانے والی ہیں اور اس میں کیا تغیرات کیے جائیں جن سے ہم ایک اسلامی نظام کو چلانے کے قابل لوگ تیار کر سکیں۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تعلیمی کمیشن نے اس مسئلہ کی طرف کوئی اچٹتی ہوئی توجہ بھی نہیں کی۔ یہ مسئلہ بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل ہے اور جب تک ہم اسے حل نہیں کر لیں گے اس وقت تک اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ کبھی ہموار نہ کر سکیں گے۔

ابن خلدون کے کسی نظریہ کی طرف رجوع کرنے سے اس مسئلہ کے حل کرنے میں مدد نہیں مل سکتی، کیونکہ اس مسئلہ کی جو نوعیت اب پیدا ہوئی ہے وہ ابن خلدون کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مسئلہ کی حقیقی نوعیت یہ ہے کہ مغربی استعمار رخصت ہوتے ہوئے ہمارے ملکوں میں اُس نسل کو حکمراں بنا کر چھوڑ گیا ہے جس کو اس نے اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب کا دودھ پلا پلا کر اس طرح تیار کیا تھا کہ وہ جسمانی حیثیت سے تو ہماری قوم کا حصہ ہے لیکن علمی اور ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے انگریزوں، فرانسیسیوں یا ولندیزیوں کا پورا جانشین ہے۔ اس طبقہ کی حکومت جو مشکلات پیدا کرتی ہے ان کو رفع کرنے کا معاملہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے جسے حل کرنا ابن خلدون کے نظریات کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑے سنجیدہ غور و فکر کی اور حالات کو سمجھ کر اصلاح کے لیے نئی راہیں نکالنے کی ضرورت ہے۔

اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق

سوال۔ اسلامی مملکت میں اقلیتی فرقوں کو مثلاً عیسائی، یہودی، بدھ، جین، پارسی،

ہندو وغیرہ کو کیا مسلمانوں کی طرح پورے حقوق حاصل ہوں گے ؟ کیا ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ بھی اسی طرح کرنے کی اجازت ہوگی جیسا کہ آج کل پاکستان اور دیگر ممالک میں کھلے بندوں پرچار ہوتا ہے ؟ کیا اسلامی مملکت میں ایسے مذہبی یا نیم مذہبی ادارے مثلاً ادارہ مکتی فوج (SALVATION ARMY) یا کینیرڈ رل، کانونٹ، سینٹ جان و سینٹ فرانسس وغیرہ جیسے ادارے، کیا قانوناً بند کر دیئے جائیں گے (جیسا کہ حال میں سیلون میں ہوا یا دو ایک ممالک میں ہو چکا ہے) یا فراخدلی سے مسلمان بچوں کو وہاں بھی ماڈرن ایجوکیشن حاصل کرنے کی عام اجازت ہوگی ؟ کیا اس صدی میں بھی ان اقلیتی فرقوں سے جزیہ وصول کرنا مناسب ہوگا۔ (عالمی حقوقِ انسانی کی روشنی میں بھی) جبکہ وہ نہ صرف فوج اور سرکاری عہدوں پر فائز اور حکومت کے وفادار رہیں ؟

جواب ۔ اسلامی مملکت میں غیر مسلم گروہوں کو تمام مدنی حقوق (CIVIL RIGHTS) مسلمانوں کی طرح حاصل ہوں گے مگر سیاسی حقوق (POLITICAL RIGHTS) مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ریاست کے نظام کو چلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور مسلمان اس بات پر مامور ہیں کہ جہاں بھی ان کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوں وہاں وہ قرآن اور سنت کی تعلیمات کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں۔ چونکہ غیر مسلم نہ قرآن اور سنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اس کی اسپرٹ کے مطابق ایمانداری سے کام چلا سکتے ہیں اس لیے وہ اس ذمہ داری میں شریک نہیں کیے جا سکتے، البتہ نظم و نسق میں ایسے عہدے ان کو دیئے جا سکتے ہیں جن کا کام پالیسی بنانا نہ ہو۔ اس معاملہ میں غیر مسلم حکومتوں کا طرزِ عمل منافقانہ ہے اور اسلامی حکومت کا طرزِ عمل صاف صاف ایماندارانہ۔ مسلمان اس بات کو صاف صاف کہتے ہیں اور اس پر عملدرآمد کرنے میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری ملحوظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی شرافت اور فراخدلی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ غیر مسلم بظاہر کاغذ پر قومی اقلیتوں (NATIONAL MINORITIES)

کو سب قسم کے حقوق دے دیتے ہیں مگر عملاً انسانی حقوق تک نہیں دیتے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو دیکھ لے کہ امریکہ میں سیاہ فام لوگوں (NEGROES) کے ساتھ اور روس میں غیر کمیونسٹ باشندوں کے ساتھ اور چین و ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ خواہ مخواہ دوسروں سے شرما کر ہم اپنے مسلک کو صاف صاف کیوں نہ بیان کریں اور اس پر صاف صاف کیوں نہ عمل کریں۔

جہاں تک غیر مسلموں کی تبلیغ کا معاملہ ہے اس کے بارے میں یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جب تک ہم بالکل خودکشی کے لیے ہی تیار نہ ہو جائیں یہ حماقت نہیں کرنی چاہیے کہ اپنے ملک کے اندر ایک طاقتور اقلیت پیدا ہونے دیں جو غیر ملکی سرمایہ سے پرورش پاتے اور بڑھے اور جس کی پشت پناہی بیرونی حکومتیں کر کے ہمارے لیے وہی مشکلات پیدا کریں جو ایک مدت دراز تک ٹرکی کے لیے عیسائی اقلیتیں پیدا کرتی رہی ہیں۔

عیسائی مشنریوں کو یہاں مدارس اور ہسپتال جاری رکھ کر مسلمانوں کے ایمان خریدنے کی کوشش کرنے اور مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی ملت سے بیگانہ (DE-NATIONALISE) کرنے کی کھلی اجازت دینا بھی میرے نزدیک قومی خودکشی ہے۔ ہمارے حکمران اس معاملے میں انتہائی کم نظری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان کو قریب کے فائدے تو نظر آتے ہیں مگر دور رس نتائج دیکھنے سے ان کی آنکھیں عاجز ہیں۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم اس حالت کے لیے دیا گیا ہے جبکہ وہ یا تو مفتوح ہوئے ہوں یا کسی معاہدہ کی رُو سے جزیہ دینے کی واضح شرط پر اسلامی حکومت کی رعایا بنائے گئے ہوں۔ پاکستان میں چونکہ یہ دونوں صورتیں پیش نہیں آئی ہیں اس لیے یہاں غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرنا میرے نزدیک شرعاً ضروری نہیں ہے۔

مطبوعات

ISLAM AND THE WORLD | تالیف : مولانا ابوالحسن صاحب ندوی۔ مترجم: ڈاکٹر آصف علی قدوائی۔ شائع کردہ : اکادمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز ۶۵۔ ریلوے روڈ لاہور۔ ملنے کا پتہ: القادر ۴۱، ایمپرس روڈ، لاہور ۵۔ قیمت ۴ روپے صفحات ۱۹۴۔

زیر تبصرہ کتاب فاضل مصنف کی مشہور تصنیف ماذا خسر العالم بالخطاط المسلمین کا انگریزی ترجمہ ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۵۰ء میں مصر سے شائع ہوئی اور اس کا دنیائے عرب میں بہت زیادہ خیر مقدم کیا گیا۔ اس کے بعد مولانا محترم نے کتاب کی افادیت کے پیش نظر اسے خود ہی نہایت سلیقے کے ساتھ اردو کے سانچے میں ڈھالا۔ اس فاضلانہ تصنیف کے عربی اور اردو میں متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اب ڈاکٹر آصف علی قدوائی صاحب نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اس کی افادیت کا حلقہ اور بھی وسیع کر دیا ہے۔ اس دور میں جب کہ مغربی علوم و فنون نے نئے انداز کی جہالت اور مادی تہذیب نے نئی قسم کی وحشت اور جدید ترقی نے ایک ایسی روشنی پھیلا رکھی ہے جس میں جہنم کی آنچوں کا اثر ہے، یہ کتاب نہایت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ کتاب کا ترجمہ شستہ اور رواں ہے۔ اور معیار طباعت نہایت عمدہ ہے۔ ہم اس فاضلانہ تصنیف کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

حیات امام احمد بن حنبلؒ | تالیف: محمد ابوزہرہ، پروفیسر لاکالج، فواد یونیورسٹی، مصر۔ ترجمہ: جناب سید رئیس احمد جعفری۔ ناشر: المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور و المکتبۃ الرحمانیہ، ۱۲۰۔ اے شاہ عالم مارکیٹ۔ قیمت دس روپے۔ صفحات ۵۰۴۔

امام احمد بن حنبلؒ امت کی مقبول ترین ہستیوں میں سے ہیں۔ رجال و سیر کی وہ تمام کتب جو رواۃ حدیث، محدثین کرام اور فقہائے امت سے بحث کرتی ہیں ان سب میں

امام صاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود ہے۔ امام احمد بن حنبل ہر لحاظ سے ایک بہت اونچی شخصیت کے مالک تھے۔ اتباعِ سنت، طہارت، تقویٰ، عزمِ راسخ، زہد و ورع، تبحرِ علم، وسعتِ نظر اور کتاب و سنت کی تفسیر و تعبیر میں فی الواقع یگانۂ عہد تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں حق گوئی اور بے باکی کی نعمت بھی عطا کر رکھی تھی اس لیے وہ غلط قیادت کی ستم رانیوں کا تختۂ مشق بنے رہے۔ انہوں نے ظلم و ستم کے ہر وار کو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا مگر اُن کے پائے استقلال میں قطعاً کوئی لغزش نہ آئی۔ امام صاحب نے اعلائے کلمۃ الحق کا فرض جس عزم اور تدبّر سے سرانجام دیا ہے وہ تاریخِ اسلامی کا ایک نہایت ہی تابناک باب ہے۔ ایسی عظیم شخصیت اس بات کی مستحق ہے کہ اُس کی حیات کا بار بار مطالعہ کر کے روشنی حاصل کی جائے۔ اسے حسنِ اتفاق کہیے کہ امام صاحب کی شخصیت جتنی بڑی ہے، اتنے ہی بڑے عالم نے اُن کی سوانح حیات مرتب کی ہے۔ استاد ابوزہرہ دنیائے اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ رسی اور علم و فضل میں وہ ایک اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کی اس کتاب "امام احمد بن حنبل" کو ان کی دوسری کتب کی طرح تحقیق کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ اس فاضلانہ تصنیف کا ترجمہ مشہور مصنّف و مترجم جناب رئیس احمد جعفری نے کیا ہے۔ ترجمہ شگفتہ اور رواں ہے۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی جیسے ثقہ عالمِ دین نے تعلیقات و حواشی لکھ کر اس کتاب کی افادیت میں بیحد اضافہ کیا ہے۔ کتابت اور طباعت کا معیار عمدہ ہے۔

استقامت تالیف: مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری مرحوم و مغفور، شائع کردہ: المکتبۃ السلفیہ۔ شیش محل روڈ، لاہور۔ پچیس روپے سینکڑہ۔

قاضی محمد سلیمانؒ منصور پوری "رحمۃ للعالمین" کے مصنف، ایک صاحبِ دل عالمِ دین تھے۔ انہوں نے ایک ایسے مسلمان کے خط کے جواب میں جس کا ایمان مسیحی پادریوں کے گمراہ کن پراپیگنڈے کی وجہ سے متزلزل ہو چکا تھا، یہ قابلِ قدر رسالہ تصنیف فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے اُس شخص کو طمانیتِ قلب عطا کی اور اس کے ساتھ اور بہت سے لوگوں کو فتنۂ تثلیث

سے نجات حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مصنف مرحوم اور اس کی اشاعت کرنے والوں کو جزائے خیر دے۔

نجاتُ الاسلام تالیف مولوی احمد الدین صاحب گکھڑوی۔ ناشر: سکول بک ڈپو، اردو بازار، گوجرانوالہ۔ قیمت آٹھ آنے۔

زیر نظر رسالہ پادری سلطان محمود صاحب کے اُن دو رسائل کا جواب ہے جن میں انہوں نے نجات کے اسلامی تصور پر مختلف اعتراضات کیے ہیں۔

مسئلہ سُود تالیف مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ ناشر: ادارۃ المعارف کراچی، اشرف منزل لسبیلہ چوک کراچی ۵۔

اس فاضلانہ تصنیف میں پاک و ہند کے مشہور عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے سود کی تعریف، تجارتی سود، جاہلیتِ عرب کا سُود، اور قرآن و سنت میں اُس کا مفہوم، اور اُس کی حرمت اور اس پر وعید شدید اور اس کی دینی، دنیوی، اقتصادی، معاشی تباہ کاریوں پر بڑے فاضلانہ انداز میں بحث کی ہے۔ یوں تو یہ ساری کتاب ہی فاضل مصنف کی وسعتِ علم اور اخلاص کی آئینہ دار ہے مگر اس کا وہ حصہ خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے جس میں انہوں نے نہایت مستند حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت عرب میں تجارتی سُود کا رواج تھا۔

صحیح مقامِ حدیث جلد اوّل و دوم تالیف: مولانا فضل احمد غزنوی صاحب بی اے، منشی فاضل، مولوی فاضل۔ ملنے کا پتہ: ادارہ تبلیغ الاسلام فضل الیکٹرک پرنٹنگ پریس، گاڑی کھاتہ، حیدرآباد سندھ۔ دونوں جلدوں کی قیمت پانچ روپے۔

مولانا فضل احمد غزنوی صاحب ملک کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ اُن کے گراں قدر مضامین پاک و ہند کے مذہبی جرائد میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اُن کی دینی حمیت اور اخلاص کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہے۔ اس کتاب کے آخری

حصہ میں مصنّف موصوف نے حدیث کی تدوین و کتابت پر نہایت ٹھوس معلومات جمع کر دی ہیں۔ ان معلومات کی روشنی میں یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ تدوین و جمع حدیث کا پورا انتظام صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ و محدثین کے عہد میں کس تسلسل کے ساتھ قائم رہا ہے اور کوئی دور بھی ایسا نظر نہیں آتا جس میں لاکھوں افراد اپنے لاکھوں شاگردوں تک احادیث رسول پہنچانے میں منہمک نہ رہے ہوں۔

تلبیس ابلیس (اردو ترجمہ) یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے نامور مصلح علامہ ابن جوزیؒ کی تالیف ہے۔ اس میں علامہ رحمہ اللہ نے مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کی کمزوریوں، بے اعتدالیوں اور غلط فہمیوں کی نشاندہی کی ہے۔ مختلف گمراہ فرقوں کی تاریخ اور عقائد کو بیان کیا ہے۔ اور مسلم سوسائٹی میں ابلیس کی دراندازی کے جو راستے ہیں انہیں ایک ماہر اجتماعیات کی حیثیت سے بے نقاب کیا ہے۔ مثلاً باب ہفتم میں یہ بتایا ہے کہ والیانِ مُلک و سلطنت پر ابلیس اپنے ذیل کے تلبیسی حربے استعمال کرتا ہے:

(۱) ان لوگوں (یعنی حکمرانوں) کے دل میں ڈال دیا کہ اللہ تعالیٰ تم کو محبوب رکھتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کیوں تم کو سلطان بناتا اور کیوں بندوں پر اپنا نائب کرتا (۲) ابلیس ان لوگوں سے کہتا ہے کہ سلطان اور والی ملک ہونے کے واسطے ہیبت درکار ہے۔ تو یہ اس کا یہ طریقہ نکالتے ہیں کہ حصولِ علم کو حقیر سمجھ کر تکبّر کرتے ہیں۔ عالموں کی صحبت کو اپنی شان کے خلاف دیکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اپنی جہالت پر عمل کرتے ہیں تو دین برباد ہوتا ہے (۳) ابلیس ان کو جانی دشمنوں سے خوف دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر طرف بہت مضبوط پہرے رکھو۔ پھر بیچارے مظلوم ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ (۴) یہ سلاطین و امراء ایسے لوگوں کو کارپرداز مقرر کرتے ہیں جو اُس کام کے لائق نہیں ہوتے۔ نہ اُن کے پاس علم ہوتا ہے اور نہ دیانت و تقویٰ (۵) شیطان ان سلاطین کو دکھلاتا ہے کہ امورِ سیاست میں داخل ہو کر تم اپنی رائے سے بہتر تدبیر و انتظام کرو گے۔ لہٰذا یہ شریعت کے مقابلہ میں اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ (۶) ابلیس ان

لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ اموالِ سلطنت تمہیں جس طرح چاہو خرچ کرو کیونکہ یہ تمہارے حکم میں داخل ہے۔ (۷) ابلیس نے امراء و سلاطین کو ترغیب دی کہ معاصی تمہارے واسطے چنداں مضر نہیں جبکہ تمہاری قوت سے ملک میں امن و امان ہے۔ (۸) ابلیس ان کو دھوکہ دیتا ہے کہ تم نے خوب انتظام کر رکھا ہے۔ حالانکہ ذرا غور سے دیکھا جائے تو ملک کے اندر بکثرت خلل موجود ہے۔ (۹) ابلیس نے اُن کو فریب دیا ہے کہ وہ معاصی پر اصرار کے ساتھ ساتھ صلحاء کی ملاقات کا بھی شوق رکھیں اور اُن سے اپنے حق میں صرف دعائیں کراتے رہیں۔ شیطان اُن کو سمجھاتا ہے کہ اس سے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے گا۔ (۱۰) بعض ملازمین سلطنت اپنے بالا دست حکمرانوں کی خاطر کام کرتے ہیں۔ حکمران ان کو ظلم کا حکم دیتے ہیں تو یہ منحوس ظلم کرنے لگتے ہیں۔ ابلیس ان کو بہکاتا ہے کہ اس ظلم کا گناہ حکمرانوں پر ہے۔ اُن پر نہیں ہے۔

اس کتاب میں علامہ ابن جوزی نے سوسائٹی کے ہر فرد اور گروہ کے لیے آئینہ مہیا کر دیا ہے۔ اس میں ہر شخص اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے قیمت دس روپے۔ ملنے کا پتہ: کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی (خ-ج)

ترجمان القرآن کے سابقہ پرچے مطلوب ہیں

قارئین ترجمان القرآن میں سے اگر کسی صاحب کے پاس حسب ذیل پرچے برائے فروخت موجود ہوں تو براہ کرم ذیل کے پتہ پر اطلاع دیں۔ تفصیل یہ ہے:-

(۱) جلد ۳۲ عدد ۵۔ اکتوبر ۴۹ء — (۲) جلد ۴۰ عدد ۱۔۲۔۳۔ ماہ اپریل تا جون ۵۳ء

(۳) جلد ۴۲ عدد ۳۔ جون ۵۴ء (۴) جلد ۵۰ عدد ۳ ماہ جون ۵۸ء

(۵) جلد ۲۳ عدد ۱۔۲ — ماہ جولائی۔ اگست

پتہ: یونس میٹل ورکس۔ گجرات۔ پاکستان

(بقیہ اِشارات)

درست کرنے کی کوشش کی گئی۔ مسجدِ اقصیٰ کی مرمت میں بھی دل کھول کر حصّہ لیا گیا۔

——— عربی اذان پر سے پابندی اٹھالی گئی جس کا ترکی قوم نے انتہائی جوش و خروش سے خیر مقدم کیا۔

——— درسگاہوں میں مذہبی تعلیم دوبارہ جاری کر دی گئی۔ خاص طور پر امام اور خطیب تیار کرنے کا اہتمام کیا گیا۔

——— مغربی ممالک کی خوشامد اور چاپلوسی کرنے کے بجائے ترکی حکومت نے اسلامی ممالک سے مودت کا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی۔ ایران و پاکستان کے ساتھ اتحاد اسی نئی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ کشمیر کے معاملہ میں پاکستان کی کھلم کھلا حمایت بھی اسی کی رہین منت تھی۔

——— اسلامی تحریکات کے ممنوع الاشاعت لٹریچر پر سے پابندی اٹھادی گئی۔[1]

ان حقیقی اصلاحات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قوم اور حکومت میں وہ دلی تعاون شروع ہو گیا اور بڑھتا چلا گیا جس کے دروازے اتاترک اور عصمت اینونو کے دور میں بند ہوتے چلے جا رہے تھے۔ قوم کے جذبات سے لڑنے والوں کے مقابلہ میں ان کا احترام کرنے والوں کو زیادہ تعاون حاصل ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ مینڈریس کے دس سالہ دورِ حکومت میں ترکی

---

[1] اس لٹریچر میں بدیع الزمان نورسی کا لٹریچر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ترکی کا یہ جلیل القدر فرزند جنگِ آزادی میں مصطفیٰ کمال پاشا کے قریب ترین ساتھیوں میں سے تھا۔ مصطفیٰ کمال کی ری پبلکن پارٹی جب تک اسلام کی حامی رہی اُس وقت تک علامہ نورسیؒ اس کے ہمنوا رہے۔ مگر جب لوزان کانفرنس میں ترکی کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو وہ الگ ہو گئے اور اُن کا لٹریچر ممنوع قرار دے دیا گیا۔ عدنان مینڈریس کے عہدِ وزارت میں "رسائلِ نور" کے نام سے ان کا لٹریچر دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا۔

کے اندر کہیں بغاوت نہیں ہوئی۔عام باشندوں نے بلند ریس کے تعمیری کاموں میں خوب حصہ لیا اور اس بنا پر انہوں نے دس سال میں ملک کی بہتری کے لیے وہ کام کیا جو ان سے پہلے ۲۷ سال میں نہ ہو سکا تھا۔اسی وجہ سے ان کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔وہ ترکی کے عوام میں کس قدر مقبول تھے، اُس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ جب لندن اور مغربی جرمنی کے رستے میں طیارے کے حادثے سے بال بال بچ نکلے تو پورے ترکی میں جشن منایا گیا اور شکرانے ادا کیے گئے۔جب وہ واپس ملک میں پہنچے تو اُن کا بڑا پُرجوش استقبال ہوا اور لوگوں نے ہزاروں دُنبے قربان کیے۔

بے دین طبقہ اس پوری مدت میں انگاروں پر لوٹتا رہا اور جوں جوں ترکی میں اسلام زندہ ہوتا گیا، اس کا غصہ بڑھتا چلا گیا۔انگلستان، امریکہ، اور دوسرے ممالک میں اسلام کے جتنے دشمن تھے، وہ سب بھی اس حالت کو بڑی تشویش سے دیکھتے رہے اور آخر میں تو انہوں نے پے در پے خطرے کی گھنٹیاں بجانی شروع کر دیں۔خصوصاً یہودی پریس اور خبر رساں ایجنسیاں تو اس پر سخت چراغ پا تھیں۔اندر اور باہر کے یہ سب لوگ اس بات سے پوری طرح مایوس تھے کہ خالص آئینی و جمہوری تدابیر سے آزادانہ انتخابات میں کبھی اُن لوگوں کو شکست دی جا سکے گی جو ترکی میں اسلام کے احیاء کے خواہش مند ہوں، یا کم از کم اُس کے لیے مواقع فراہم کریں۔اس لیے اندر والوں نے بلند ریس کی حکومت کے خلاف سازشیں اور فتنہ پردازیاں شروع کر دیں۔اور باہر کے دشمنِ اسلام پریس اور خبر رساں ایجنسیوں نے ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے پروپیگنڈا شروع کر دیا۔یہودی یوں تو پوری دنیائے اسلام کے سخت دشمن ہیں لیکن وہ خاص طور پر ترکی میں احیائے اسلام کی کسی تحریک کو گوارا نہیں کر سکتے۔ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ یہ ملک الحاد و بے دینی کا شکار رہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کی سب سے بڑی تنظیم، یعنی بین الاقوامی یہودی فیڈریشن کا صدر مقام ترکی میں ہے اور صیہونی نظریے کا سب سے بڑا

علمبردار سامی کو براج وہیں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد یہودی انجمنیں وہاں کام کرتی ہیں اور اسرائیل کو وہاں سے ہر قسم کی امداد بہم پہنچائی جاتی ہے۔ یہودیوں کے لیے ٹرکی کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اُس کا اندازہ اس ایک امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں اسرائیل کے سفارت خانے میں ۴ بلند پایہ یہودی علماء اور انشا پرداز صرف پراپیگنڈے کے کام پر متعین ہیں۔ عدنان مینڈریس سے یہودی اور مغربی پریس کو کس حد تک دشمنی تھی اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہی دیکھ لینا کافی ہے کہ عصمت انونو کی پارٹی نے اپنے دورِ حکومت میں برسہا برس تک سوائے چند سرکاری اخبارات کے کسی شخص یا ادارہ کو اخبار نکالنے کی اجازت نہ دی تھی، مگر مغربی اور یہودی پریس نے اُس کی اس آمرانہ حرکت کے خلاف ایک لفظ تک بھی نہ کہا۔ مگر جب مینڈریس نے اس پریس کی فتنہ سامانیوں کے پیشِ نظر "وطن" اخبار کو چند ماہ کے لیے بند کر دیا تو پورے امریکی پریس اور بین الاقوامی پریس ایسوسی ایشن نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور اس ایک واقعہ کو آڑ بنا کر مینڈریس کو دنیا بھر میں رُسوا اور بدنام کر دیا۔

مینڈریس سے گلو خلاصی پانے کے لیے بالآخر غیر آئینی انقلاب کا نسخہ آزمایا گیا، یعنی ملک کی ناقابلِ التفات اقلیت نے صرف اس بنیاد پر کہ اسے فوج اور نظم و نسق میں غلبہ حاصل ہے، اُس حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جو عوام کی اکثریت کے ووٹوں سے آئین و قانون کے مطابق برسرِ اقتدار تھی۔ پھر محض تختہ الٹنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اکثریت کے ان نمائندوں کو پھانسی اور عمر قید کی سزائیں بھی دے ڈالی گئیں، تاکہ ترکی عوام اس بات سے بالکل مایوس ہو جائیں کہ وہ کبھی آئینی و جمہوری طریقوں سے انتخابات کے ذریعہ اپنی مرضی کے آدمی اوپر لا سکیں گے۔

اپنی اس کارروائی سے یہ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے گویا ہمیشہ کے لیے ترکی میں لادینی کا مستقبل محفوظ کر دیا ہے۔ مگر یہ محض فریبِ نظر ہے۔ اس طریقِ کار سے وقتی طور پر تو مخالفانہ تحریکات کو دبایا جا سکتا ہے لیکن اس کے اثرات نہ ایسے کھیل کھیلنے والوں کے حق میں

مفید ثابت ہوتے ہیں اور نہ ان کی قوم کے حق میں قوت و حافت کے زور سے زبانوں پر تو پہرے بٹھائے جاسکتے ہیں، لوگوں کے ہاتھوں سے قلم تو چھینے جاسکتے ہیں لیکن دل و دماغ کی دنیا تعزیر و زنجیر کی حدود سے یکسر باہر ہوتی ہے۔ وہاں انسان کا ضمیر جبر و اکراہ کے بغیر فیصلے کرتا ہے اور پھر احساسات و جذبات اُن کے فیصلوں میں قوت پیدا کر کے انہیں مختلف تحریکات کی شکل دیتے ہیں۔ یہی حال آج ترکی میں ہو رہا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں بار بار یہ سوال اُبھر کر آتا ہے کہ مینڈریس کا بڑے سے بڑا جرم اگر کوئی تھا بھی تو وہ صرف پکڑ دھکڑ، کتابوں کی ضبطی اور بعض اخبارات کی بندش تک محدود تھا۔ لیکن اُن لوگوں کو مجرموں کے کس کٹہرے میں کھڑا کیا جائے جنہوں نے ستائیس برس تک پوری قوم کو استبداد کے شکنجے میں کسے رکھا، پھر آئین و قانون کو بالائے طاق رکھ کر اکثریت کی نمائندہ حکومت کا تختہ اُلٹا، پھر اس کے لیڈروں کو ختم کرنے کے لیے عدالت کا ڈرامہ کھیلا اور انتقام کے جوش میں انہیں موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی گریز نہ کیا۔ لوگ سوچ رہے ہیں کہ آج مغربی اور یہودی پریس کو کیوں سانپ سونگھ گیا ہے کہ وہ اس ظلم کے خلاف احتجاج کا ایک لفظ بھی کہنے کے لیے تیار نہیں؟ اسی قسم کی ظالمانہ حرکت اگر مینڈریس اور اس کے رفقاء کار سے سرزد ہو جاتی تو یہی پریس اس پر جیسا کچھ طوفان اٹھاتا اسے دنیا دیکھتی۔ محض اسلام پسند طبقوں ہی کے خلاف دنیائے مغرب میں یہ بغض و عناد کیوں ہے؟ یہ اور اسی قسم کے بہت سے سوالات آج ترک عوام ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے دل و دماغ میں اضطراب پیدا کر رہے ہیں۔ اور یہی وہ سوالات ہیں جو نفرت کے احساسات میں ڈھل کر ترکی قوم کے اندر ایسی سر پھٹول شروع کر سکتے ہیں جس سے اس ملک کو شدید نقصان پہنچنے کا ہر وقت احتمال موجود ہے۔

تاریخ کی اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی لوگوں کو تنگ نظر اور متعصب کہنے والے وہ لوگ ہیں جن کا اپنا دامن ہر قسم کے ظلم و ستم سے داغدار ہے۔ یا سیدا کے مقدمہ میں

میندریس اور ان کے ساتھیوں کا سب سے بڑا جرم یہ بنایا گیا کہ انہوں نے دستور کی خلاف ورزی کی تھی۔ مگر عجیب لطیفہ ہے کہ اس جرم پر انہیں پکڑنے اور سزا دینے کے لیے وہ لوگ اٹھے جنہوں نے پورے دستور ہی کو اٹھا کر پھینک دیا تھا درآنحالیکہ وہ دستور ہی کی حفاظت و پاسبانی کی قسم کھا کر ترکی حکومت کی ملازمت میں داخل ہوئے تھے۔ اگر میندریس ملکی دستور کی چند دفعات توڑنے کے لیے سزا کا مستحق تھا تو آخر وہ لوگ کس چیز کے مستحق ہیں جنہوں نے پورا کا پورا دستور منسوخ کر دیا اور اپنے اس عمل سے آئین کی حرمت ختم کر کے رکھ دی؟ کیا اس طرح سے ترکی کے اندر کبھی بھی آئین و دستور کا احترام پیدا ہو سکتا ہے؟ ملک کے مستقبل کا فیصلہ جب ایک دفعہ قاضی شمشیر کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو پھر اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ عدل و انصاف اور کسی ضابطہ کے تحت یہ کام سر انجام دے گا۔ وہ پھر جس طرح چاہے گا معاملات طے کرتا رہے گا اور کوئی قوت بجز سینہ زوری کے اس کے راستہ میں حائل نہ ہو سکے گی۔

جمہوری و دستوری روایات چند دنوں، یا چند مہینوں یا چند سالوں میں نہیں بنتیں۔ یہ دھیرے دھیرے کسی قوم کے دل و دماغ میں مستحکم ہوتی ہیں۔ ان کے استحکام سے ہی کسی قوم اور ملک کا استحکام وابستہ ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ اپنی قوم اور وطن کے حقیقی خیر خواہ ہوتے ہیں وہ کبھی آئینی روایات کو مٹانے کے درپے نہیں ہوتے بلکہ ان کو ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اگر کسی من چلے نے احترام قانون کی روایات کو ایک دفعہ پامال کرنے کی جرأت کی تو پھر ان کا بحال ہونا قریب قریب محال ہے۔ ترکی میں لادینی کے علمبردار عنصر نے بلاشبہ مسندِ اقتدار حاصل کر لی ہے لیکن اس کوشش میں اُس نے اپنی نادانی سے آئین و قانون کے خلاف جسارت کے بیج بھی بو دیئے ہیں۔ ترکی کے لیے یہ کوئی نیک فال نہیں۔ آج اگر تطہیر کے نام پر میندریس اور اُس کے ساتھیوں کو پھانسیوں پر لٹکایا جا سکتا ہے تو کل کسی زیادہ قوت و طاقت رکھنے والے گروہ کے ہاتھوں دوسروں کا

بھی یہی حشر ہو سکتا ہے۔ یہ اگر ایک طرف مینڈریس کی پارٹی کا مقطع ہے تو یہی ایک دوسرے پُر فتن دور کا مطلع بھی ہو سکتا ہے۔

مینڈریس اور اس کے حسرتناک انجام کو دیکھ کر ترکی کے اندر کوئی شخص جو اپنے ہوش و حواس قائم رکھتا ہو ملک کی زمامِ کار اطمینان کے ساتھ نہیں سنبھال سکتا۔ اُسے ہر لمحہ اس بات کا خدشہ لاحق رہے گا کہ کوئی آئین و قانون اس کی پوزیشن بچانے والا نہیں ہے، کسی وقت بھی اُسے قوت کے ساتھ اقتدار سے محروم کر کے نہ صرف ذلیل و خوار کیا جا سکتا ہے بلکہ موت کے گھاٹ بھی اتارا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے روح فرسا ماحول میں جہاں آدمی کے سر پر ہر وقت تلوار لٹک رہی ہو، کوئی شخص محض اپنی قابلیت کی بنا پر عوام کو اعتماد میں لے کر آگے نہیں آ سکتا۔ ایسے حالات میں تو اقتدار کی باگیں بالکل قدرتی طور پر ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہیں جو سازشوں اور زیر زمین سرگرمیوں کے ماہر ہوتے ہیں۔ اس طرح خاموش اور عاقبت اندیش مدبر گمنامی کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور بساطِ سیاست پر وہ کھلاڑی چھا جاتے ہیں جو ملک اور قوم کے خادم بن کر رائے عامہ کی تائید حاصل کر کے مسندِ اقتدار حاصل نہیں کرتے بلکہ محض چالبازیوں اور عیاریوں اور قوت کی مدد سے قوم پر اپنی خدائی قائم کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔

خدا کرے ترکی اس انقلاب کے بُرے نتائج سے محفوظ رہے۔

یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ ترکی کے تازہ انتخابات کے نتائج سامنے آ گئے۔ ان نتائج نے ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگر ترکی قوم کو حکومت چلانے کے لیے اپنی مرضی کے نمائندے منتخب کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ کس طرح کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگیں دینا پسند کرتی ہے اور کن لوگوں کو ناپسند کرتی ہے۔ باوجود اس کے کہ انتخابات اسی فوجی اقتدار کے زیر اثر ہوئے ہیں جس نے عدنان مندریس کی پارٹی کا تختہ اُلٹا تھا اور جس نے مینڈریس اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دے کر عین انتخابات کے آغاز ہی میں قوم کو خوف زدہ اور ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی اور قانون کی رُو سے بھی انتخابات میں مذہب کا نام لے کر اپیل کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا پھر بھی عصمت انونو کی پارٹی ترکی قوم کی تائید حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سول اور فوج کے ملازمین کی اکثریت جو لادینی کی علمبردار ہے قوم کے اس فیصلے کے آگے سر جھکاتی ہے یا پھر وہی انقلابی ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے جن سے اس نے اکثریت کے منتخب نمائندوں کو ہٹا کر اپنی مرضی چلانے کی پہلے کوشش کی تھی۔

ہماری زیرِ طبع کتابیں

از سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامی ریاست

- علم سیاست اور تاریخ پاکستان پر ایک عظیم کتاب
- اسلام کے سیاسی نظریے کی مستند تشریح • اس کے نظام ریاست کی مکمل تصویر
- علمائے تاریخ، طلبا اور عام ناظرین کے لیے ایک گرانقدر خزانۂ علم۔

سنت کی آئینی حیثیت

ترجمان القرآن کے "منصب رسالت نمبر" کو آپ کی لائبریری اور مستقل مطالعہ کے لیے عمدہ سفید کاغذ پر خوبصورت طباعت مضبوط جلد اور دیدہ زیب گردپوش کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اسلام کا نظامِ حیات

- مولانا ممدوح کی پانچ نشری تقاریر کا دیدہ زیب مجموعہ • انسانی علم وفضل کا شاہکار

۱۔ اسلام کا اخلاقی نظام ۲۔ اسلام کا سیاسی نظام ۳۔ اسلام کا معاشرتی نظام، ۴۔ اسلام کا اقتصادی نظام ۵۔ اسلام کا روحانی نظام۔

نشری تقریریں

تقسیم ہند سے پہلے آل انڈیا ریڈیو اور تقسیم کے بعد ریڈیو پاکستان کی نشرگاہ لاہور سے مولانا مودودی صاحب نے "اسلام کے نظام حیات" کے علاوہ بھی بہت سی تقاریر نشر کی ہیں۔ ان سب کا مجموعہ پہلی مرتبہ شائع کیا جا رہا ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم

یہ وہ مفصل اسکیم ہے جو مولانا مودودی صاحب نے قومی تعلیمی کمیشن کے روبرو پیش کی تھی۔ نظام تعلیم کا وہ منصوبہ جس کے مطابق تعلیم پاکر ہماری آئندہ نسلیں مسلم ومومن بن کر دینی اور دنیوی زندگی کے ہر میدان میں دنیا کی دوسری قوموں کے شانہ بشانہ بلکہ ان کی رہنما بن کر چلنے کے قابل بھی ہو سکیں۔

از فضل الرحمٰن نعیم صدیقی

امریکہ کا صدارتی نظام

- اس کے روشن اور تاریک پہلو
- امریکی صدارتی نظام کا بے لاگ تجزیہ۔
- قانون اور سیاست کے علماء اور طلباء اور عام ناظرین کے لیے ایک نادر کتاب

از چوہدری بہادل خان ناگرہ

اصلاحِ معاشرہ میں نماز کا مقام

نظرثانی شدہ دوسرا ایڈیشن — قیمت ۱٫۳۷

کلمۂ پاک

۰٫۳۷

نوٹ: بعض مشکلات کی وجہ سے ہر کتاب محدود تعداد میں شائع ہو رہی ہے۔ خواہشمند حضرات ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر مطلوبہ کتب یا کتاب اپنے لیے ریزرو (محفوظ) کروالیں۔ اس طرح محفوظ کرائی جانے والی کتب تیار ہونے پر بلا محصول ڈاک بذریعہ وی پی ارسال کر دی جائیں گی۔

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۱۱۔سی، شاہ عالم مارکیٹ لاہور